رنگ خوشبو میرا حوالہ ہے

یوسف خالد

رنگ خوشبو مرا حوالہ ہے

یوسف خالد

یوسف خالد

حرف زاد پبلی کیشنز

اسلام آباد/ کراچی

03329422257

کتاب ایک کاغذی پیراہن ہی نہیں لیے ہوتی بل کہ اِس کا پیغام آفاقی ہوتا ہے۔کتاب افراد کی تربیت اور تعلیم میں جو اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔آج کا متمدن معاشرہ اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔کتاب ہی فرقہ واریت،علاقائیت اور قومیت جیسے محدود جذبوں سے ہٹ کر معاشرے میں انسان دوستی،بھائی چارہ اور روحانی قدروں کو جِلا بخشتی ہے۔

ضابطہ

سرنامہ	:	رنگ خوشبو مرا حوالہ ہے
معروض	:	شعر نوائی
نوامند	:	یوسف خالد
سرورق	:	فیض محمد شیخ
تزئین	:	فیض محمد شیخ
اشاعتی شمارہ	:	اوّل
استحقاق	:	حقوق بحق شاعر محفوظ ہیں
منتظم	:	نوید فداستی
تعداد کتب	:	ایک ہزار
تقویمی حوالہ	:	اپریل دو ہزار اکیس
مبادلہ	:	پانچ سو روپے

انتساب

ڈاکٹر یونس خیال

کے نام

یوسف خالد کے دیگر شعری مجموعے

زرد موسم کا عذاب ——————— ۱۹۹۱

ابھی آنکھیں سلامت ہیں ——————— ۲۰۰۹

ہوا کو بات کرنے دیں ——————— ۲۰۱۲

خواب سفر کا رستہ ——————— ۲۰۱۵

اسے تصویر کرنا ہے ——————— ۲۰۱۷

قوسِ خیال (قطعات) ——————— ۲۰۲۰

تسبیح

یوسف خالد کا شعری چمن زار	دیباچہ	اکرم کُنجاہی	۱۰
جناب یوسف خالد کی شاعری		عابد سیال	۲۴
پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی یاد میں			۳۰
ضد نہ کر			۳۲
بہت مصروف ہوں			۳۴
سب لفظ عاجز ہیں			۳۶
میں اگر آئینہ بھی ہوتا تو			۳۸
وہ رنگ و نور کا پیکر ہے			۴۰
رائگانی			۴۲
زندگی روٹھی ہوئی ہے			۴۳
یہ ناممکن نہیں ہے			۴۶
ایک مدہم روشنی ہے			۴۸
ریشمی ملبوس			۵۰
میں البم کھولتا ہوں			۵۲
اُسے خبر تھی			۵۴
اُسے مجھ سے شکایت ہے			۵۶
بالکونی میں نیا موسم اُترتا ہے			۵۸
مجھے بولنا نہیں			۶۰
نئی افتاد			۶۲
بھید			۶۴

یونس خیال کے لیے ۶۵
زندگی زندگی کو مل جائے ۶۷
کسی صورت ۶۹
گرہیں ۷۱
نظامِ ہستی ۷۳
جیسے کچھ یاد آ رہا ہے مجھے ۷۵
اعتراف ۷۶
زندگی ہاری نہیں ہے ۷۷
سرِ نیاز جھکائے دعائیں مانگتا ہے ۷۹
سوچ کا آزار ۸۰
عجب مستی کا عالم ہے ۸۱
اُدھورا خواب ۸۲
وقت سے آگے نکلی ہوئی نظم ۸۴
کرونائی ماحول کی تنہائی میں لکھی گئی نظم ۸۸
الوداعی رقص ۹۰
چلو رختِ سفر باندھیں ۹۲
مسائل کی گرہیں کیسے کھلیں ۹۴
اُدھوری سرخوشی ۹۷
دکھ ۹۹
درونِ صحنِ شناسائی پھیلتی خوشبو ۱۰۱
آ کر لیں کسی طور محبت کا اعادہ ۱۰۳
طلب میں تھی عجب بے اختیاری ۱۰۵
وہ صورتِ گلاب ہے ہر سو کھلا ہوا ۱۰۷

محبت بولتی آنکھوں کا تہذیبی حوالہ ہے ۱۰۹
ہمارے ذوقِ رفاقت سے بے خبر ٹھہری ۱۱۱
ہم تو خوشی کی راہ میں حائل نہیں ہیں دوست ۱۱۳
ہم اعتبارِ فکر و نظر لے کے آئے ہیں ۱۱۵
ہم اپنے عہد سے وابستہ بھی جدا بھی ہیں ۱۱۷
منظروں کی طرح سجاؤں تجھے ۱۱۹
جو سپنا آنکھ میں رکھا ہوا ہے ۱۲۰
جو خوشبو کی طرح مہکا گیا ہے ۱۲۲
جانے کیسا رشتہ ہے تقدیر کے ساتھ ۱۲۴
انوکھا درد ہے سب سے جدا ہے سر خوشی میری ۱۲۶
انتہائے گفتگو ہے خامشی ۱۲۸
اک عجب صورتِ حالات سے دوچار ہیں ہم ۱۳۰
اک بہاؤ کی کہانی ہے میاں ۱۳۲
اب ہر اک منظر ہے زیرِ آب میری آنکھ میں ۱۳۴
جب بھی کسی کے سر میں سماتی ہے بے حسی ۱۳۶
یہ بھی بہت ہے جستجوئے ناتمام میں ۱۳۸
رہبر و رہنما یا نبیؐ آپؐ ہیں ۱۴۱
نبیؐ کی نعت لکھنا چاہتا ہوں ، باہنر کر دے ۱۴۳

یوسف خالد کا شعری چمن زار

(دیباچہ)

اکرم کُنجاہی

جناب یوسف خالد کے اسلوبِ بیاں پر سرسری سی نظر بھی ڈالی جائے تو اُن کا کہنا بالکل بجا لگتا ہے کہ "رنگ خوشبو مرا حوالہ ہے" اُن کی لفظ بندی کا اختصاص ہے کہ تخلیقات بالخصوص مدحیہ نظموں کی تلفیظ کا تجزیہ مخصوص لسانی مزاج کو واضح کر رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بجا ہے کہ غزل اور نظم کے تیکنیکی بُعد کے باوجود الفاظ کے چناؤ میں کوئی فرق نہیں۔ اُن کے ہاں حسنِ فطرت کا بصیرت افروز احساس نظموں کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ اُن کی لفظیات مقامیت کی آئینہ دار ہیں جن کو شائستگی اور نفاست کے ساتھ برتا گیا ہے اور اُن کی تشکیلات میں تصنع اور ملمع کاری نہیں ہے۔ یہ الفاظ اُردو ادب میں کبھی اجنبی رہے ہیں اور نہ ہی کوئی قاری اُن میں اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ مزید براں اُنہوں نے خود کو کھردرے اور غیر فصیح الفاظ سے حتی المقدور دور رکھا ہے۔ اگرچہ اُن کے ہاں الفاظ غالب طور پر اپنے متعین، واضح اور قطعی معانی ہی میں آئے ہیں لیکن کہیں کہیں جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی خاص طور پر جن نظموں میں دوا دوار کا سماجیات کے حوالے سے موازنہ کیا ہے وہاں لفظ علامت میں بھی بدلے ہیں، لغوی نہج کو رد کیا ہے اور وہ زیادہ معنی آفرین ہو گئے ہیں۔ جدید عہد کے انتشار، بے سکونی، افراتفری اور ہنگامہ خیزی کے لیے الفاظ ہمارے میکانکی عہد کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے کہ فرطِ طرب میں جھومتے بادل، چاند کا عکس و چاندنی کا لمس، بارش کی کن من کن من، نیلگوں آسمان، طلوعِ آفتاب کی دلکشی، شفق کی لالی، بزمِ مہ و انجم، کہکشائیں سب اِس عہدِ ستم شعار میں ہم سے گریزاں ہیں۔ مثلاً اپنی نظموں میں وہ جن دو دنیاؤں کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں اُن میں ایک تو اُن کے سپنوں کی دنیا ہے جو انہوں نے اپنے بچپن میں دیکھی، وہ امن و آشتی اور پیار و محبت کا استعارہ تھی۔ خطِ تقسیم کے دوسری طرف موجودہ

عہد ہے جس کے لیے شاعر نے رفتار، شور، ہنگامہ خیزی، بے اطمینانی، بدبو دار میلی ہوا، دھوئیں کی چادر، موسم کی شدتیں، زہر ناکی، خوف کا منظر، زندگی ناپید، اندھا سفر، مصنوعی زندگی جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ بہر حال اُن کے کلام میں الفاظ خواہ لغوی طور پر برتے گئے ہوں، علامت کے طور پر یا تراکیبوں کی تشکیل میں، ایک بات قطعی ہے کہ اُن میں سلاست، فصاحت اور روانی ہے۔ مندرجہ ذیل طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ہاں سوقیانہ اور عامیانہ الفاظ نہیں ملتے برگ، گلاب، ہوا کا جھونکا، صبحِ روشن، اُجالا، اندھیرا، پوہ، نیند، سپنے، خواب، چشمے، دریا، سمندر، خوشبو، آئینہ، حسین وادی، حسیں فضائیں، دیا، روشنی، تاریکی، برگد، کچے راستے، کچے گھر، کچی گلیاں، سرسوں، مہک، چرواہے، ریوڑ، پرندوں کی ڈاریں، سبزہ وگل، خوشنما درخت، راحت افزا منظر، آسمان، ڈیرے داریاں، ڈھولے ماہیے، رتجگے، کہکشاں، آرزوئیں، وصل، نیم خوابیدہ خواہش، نہاں خانۂ دل، گلدان، حسیں تکیہ، کھڑکی کی چلمن، چاندنی کا عکس، ریشمی ملبوس، حرارت دان، کہسار، سبزہ، خزاں نا آشنا، گھونسلے، پھولوں کا مسکن، سفید پھول، دھنک کے رنگ، حسیں موسم، شاخسار، ننھی چڑیاں، نازک پتیاں، رقص، اُوس قطرے، دمکتے خواب، شبِ مہتاب، شبنمی کرنیں، جگنو، ستارے، لہریں، مدوجزر، ساحل دریا، ٹھنڈی ریت، کشتی، ملاح، گرداب، گنگناتی ندیاں، سندر بستیاں، سرسبز بیلیں، تتلیاں، فاختائیں، گرتی آبشاریں، بہتے چشمے، بل کھاتی پگڈنڈیاں، جھومتے لہراتے دریا، دھند میں لپٹے مناظر، سحر نما آشنائی، سطحِ آب، رنگِ شفق، ملگجی سایہ، گھنے جنگل، ٹیلے، صحرا، گہرے سمندر، دھوپ چھاؤں، کچا گھڑا، ناقۂ لیلیٰ، مجنوں کی قبا، جھنگ کا بیلا، کیچ، بھنبور، یہ الفاظ اِس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ اُنھوں نے مناظرِ فطرت کی ایسے مصوری کی ہے کہ وہ بالکل حقیقی محسوس ہو رہے ہیں۔ ایک عہد، مقام اور ماحول کی سچی متحرک تصویریں سامنے لا رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں یک کرداری افسانے کی طرح اُن کی نظموں میں اپنی محبوب ہستی سے مکالمہ بھی ہے۔ یوسف خالد نے جن مناظر کو نظموں میں پیش کیا ہے وہ حقیقی معلوم ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ حقیقی ہیں کہ جن کی آغوش میں اُنھوں نے پرورش پائی ہوگی۔ یوں اپنے آس پاس کی بنیاد پر اُنھوں نے لاجواب نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اپنی نظم "نئی افتاد" میں وہ کہتے ہیں کہ یہ مناظرِ فطرت انسان کا اثاثہ ہیں مگر یہ انسان ہی ہے جو زمین کا امن تاراج کر کے انہیں کھو دینا

چاہتا ہے۔ یہ اُس کی کم عقلی اور ناسمجھی ہے۔ اسی طرح "مسائل کی گرہیں کیسے کھلیں" میں بھی شاعر نے خوب صورت مناظرِ فطرت کی لفظی مصوری کی ہے اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہم خود اِن کو برباد کر رہے ہیں۔ مسائل کی نئی نئی گرہیں لگاتے رہتے ہیں، اب یہ گرہیں کیسے کھلیں؟ نظم کی ابتدائی لائنوں میں مناظرِ فطرت کی صورت میں انسان کو عطا کی گئی اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہے جو اللہ کریم نے انسان کو فراوانی سے بخشی ہیں اور آخری لائنیں ملاحظہ کیجیے جن میں شاعر نے کہا ہے کہ اِن فطرت کے انمول خزانوں کو تباہ و برباد کرنے والے بھی ہم خود ہی ہیں۔

صباحت آشنا احساس کو پامال کرنے
آس کی پگڈنڈیوں پر اُگنے والے سبزہ و گل کو
ہمیشہ کے لیے ناپید کرنے کا خصوصی اذن بخشا ہے
ہمیں اب رنگ، خوشبو، سُر
لطافت سے بھری رعنائیاں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں یہ الجھنیں، بے تابیاں
اور مستقل آزار کی سب صورتیں راس آ گئی ہیں

نظم "اُسے مجھ سے شکایت ہے" میں شاعر نے اپنا فلسفۂ شعر بھی بیان کر دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ میری محبوب ہستی کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں غلو کی حد تک حسن کی تعریف کرتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں حسن و جمال کو پسند کرتا ہوں اور ہر حسین شے کی توصیف کرتا ہوں۔ اس لیے کہ زندگی میں دکھ درد، مسائل اور پریشانیاں بے شمار ہیں۔ انسان کچھ وقت کے لیے اُن سے نظریں چرا کر قدرت کے حسین اور شاہکار تحفوں سے لطف اٹھا سکتا ہے۔ کچھ دیر ہی کے لیے سہی اپنے غموں کو بھول سکتا ہے۔ دکھوں کو کم کر سکتا ہے۔ اُن کی چند نظموں میں ترکیبیں بھی نظر نواز ہوئی ہیں۔ مثلاً آرزو کے نگینے، نظموں کے پیرہن، نیند کی دیوی، ہونٹوں کی قاشیں، خیال کی وادی، خامشی کا جزیرہ، خواہشوں کا روپ، صحنِ جاں، سوچ کا ملبوس، حجلۂ جاں، یادوں کی راہداری، کشتِ دل، ذہن

و دل کا کینوس، خواب کے پور، ہوس کا جال، آرزو کا جہاں، بیتے دن کی چوکھٹ، اشہبِ وقت، احساس کی چادر، تمدّن کے دریچے، عمر کی پونجی، مسائل کی گرہیں، سینے کی بھٹی، آس کی پگڈنڈی، خواہشوں کے بیج، بدن کی سرزمیں، رگوں کی کیاری، خواہش کے بطن، لاحاصلی کی چادر، خواہش کی انگلی، موسم کی کوکھ۔ اُن کی نظم "ادھوری سرخوشی" میں کئی شعری ترکیبوں کا خوب صورت استعمال ہوا ہے۔ یہ ترکیبیں مصارع میں بالکل فطری انداز میں آئی ہیں۔ ایسا ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ زبردستی ان کو مصارع کا حصہ بنایا گیا ہے یا مصارع اِن ترکیبوں کی خاطر اختراع کیے گئے ہیں۔

''اُدھوری سرخوشی''

ہم اپنی روح میں اترے ہوئے
سب موسموں کا حال
لکھنا چاہیں بھی تو لکھ نہیں سکتے
کہ ہر موسم نئے انداز سے یلغار کرتا ہے
بدن کی سرزمیں پر
اک نئے احساس کی بنیاد رکھتا ہے
رگوں کی اضطرابی کیاریوں میں
خواہشوں کے بیج بوتا ہے
ہوا کے نرم روجھونکوں سے خواہش کے بطن سے
پھوٹنے والے حسیں پھولوں کا استقبال کرتا ہے
بدن کی بھری بھری مٹی میں خوشبو گھولتا ہے
روح کو سرشار کرتا ہے
مگر یہ کیا کہ موسم کے بدلنے سے

رگوں سے روح تک پھیلا ہوا خوشبو بھرا منظر
بدلنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے
اُدھوری سرخوشی
لاحاصلی کی زرد چادر اوڑھ لیتی ہے
ہم ایسے میں بھلا کیسے
کسی خواہش کی انگلی تھام کر
تیور بدلتے موسموں کی کوکھ سے تخلیق ہوتی
نیم جاں، بے نام، بے چہرہ
کسی آسودگی کو حرزِ جاں کر لیں

یوسف خالد کی بیشتر نظمیں اُن کے جمالیاتی ادراک و محسوسات سے تخلیق پائی ہیں اور یہی اُن کے جمالیاتی تجربے کی بنیاد ہے۔ شاعری اُن کے دل کی دھڑکن ہے جو کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ اُنہوں نے جن الفاظ کی قوت و توانائی سے نظموں کو جمالیاتی رنگ سے آشنا کیا ہے اُن کی فہرست طویل ہے۔ حسن کا ادراک اُن کی ذات کا داخلی پہلو ہے اور اظہار کا تعلق خارجیت سے ہے جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ داخلیت کے حوالے سے اُن کے ہاں جذبہ، احساس اور لاشعور کی آمیزش ہے مگر جب یہ وجدانی کیفیات اظہار پاتی ہیں تو اپنے تخلیقی حسن کی بدولت پُرکشش بن جاتی ہیں۔ اُن کے ہاں جذبوں کی حدّت کی تجسیم بھی ہے اور خواہشوں کی انگڑائیاں بھی۔ حسن و جمال کی دھنک رنگ پیرہن بھی ہیں اور دل ربائی کی ادائیں بھی۔ اُن کی نیم سراپائی نظموں میں تشبیہاتی نادرکاری کا وصف قاری کو گرفت میں لیتا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اِس میں اگر کچھ غلو کا گمان بھی ہو تو بھی یہ چیز تہذیبِ شعر کا حصہ ہے لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ شاعر کی نیم سراپائی نظمیں بلیغ اور پیکر آفریں ہیں کہ اِن میں اختراعانہ استعداد، خلاقی و صنّاعی نمایاں ہے۔ یوں یہ نیم سراپائی نظمیں ہوں یا منظر نگاری پر مبنی ہوں، یہ اصل مناظرِ فطرت یا نسائی حسن سے بھی خوب صورت ہیں، اِس کی غایت یہ ہے کہ تخلیقات میں قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ آرٹ کا

حسن بھی شامل ہوجاتا ہے تو اُن کی دل کشی اور رعنائی پہلے سے بڑھ جاتی ہے۔ ہمارا محدود شعور ،فطرت کے لا محدود جمالیاتی زاویے اور بے شمار نکاتِ جمال دیکھنے کی تاب وتواں نہیں رکھتا، ایک فن کار مصور ہو یا شاعر اپنے آرٹ کے ذریعے حسن کے نئے نئے مفاہیم اور نکاتِ دل بری سے آشنا کرتا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ ضرور مبہوت رہ جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ جو یوسف خالد کی نظموں میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ فلسفی پلاٹنس (۲۰۴ء تا ۲۷۰ء) نے سچ کہا تھا کہ عورت حسنِ مجسّم ہے، ہر شے کا حسن عورت ہی کے حسن کا پرتو ہے۔ وہ نسوانی حسن کی برتری کا قائل تھا۔

لفظیات: عارض، مدھ بھری آنکھیں، ریشمی زلفیں، خوب رو چہرہ، منور آنکھیں، خال وخد کی دلکشی، ہونٹوں کی احمریں قاشیں، گالوں کی خوش نما رنگت، زلفوں کے ریشمی حلقے، پیکر کی دلنشیں قوسیں، چال قیامت، گفتگو آبِ رواں، پری چہرہ، خوش نمائی، ہونٹ مسکن، خال وخد اجلے اُجلے، صباحت کا شاہکار، دل نواز، رنگ ونور کا پیکر، پھولوں سی خوب رو، مثل خوشبو، سبک خرام، خوش خصال، خوش رنگ، خوش لباس، مثل قوسِ قزح، خوش کلام، خوشنما زلفیں، عارض ولب، گھنی پلکیں، دلنشیں ابرو، حنائی ہاتھ، سیاہ زلفیں، شوخ سرخ لباس، ارغوانی خال وخد، بھرے شانے، سندر ابرو، حیات افروز مسکراہٹ، نرم رو گفتار، مرمریں کومل بدن۔

"سب لفظ عاجز ہیں"، "میں اگر آئینہ ہوتا تو۔"، "وہ رنگ ونور کا پیکر ہے"، "گریں"، "یہ ناممکن نہیں ہے"، "اُسے خبر تھی"، "بالکونی میں نیا موسم اُترتا ہے" یہ ساری جمالیاتی رنگ کی نظمیں ثابت کرتی ہیں کہ اُن کا بنیادی رنگ حسن وعشق ہی ہے۔ یہ غزل ونظم دونوں میں نمایاں ہے مگر نظم میں پیش کش جزئیات کے ساتھ ہے۔ اُنہوں نے خود اپنی نظموں میں اِس بات کا اظہار کیا ہے کہ حسن جس رنگ میں جہاں ہو انہیں متاثر کرتا ہے۔ جب اپ اُس کا تاثر قبول کرتے ہیں تو لازمی طور پر اسے اپنی شاعری کا حصہ بھی بناتے ہیں۔ یہ حسن وجمال کہیں مناظرِ فطرت کی شکل میں ہے اور کہیں صنفِ لطیف میں مجسّم ہے۔ اُن کے تخیل کا کمال ہے کہ وہ مقدور بھر جزئیات کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ کئی نظموں میں محبوب ہستی کا سراپا بیان کرنے میں کم مائیگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ "زندگی زندگی کو مل جائے" دعائیہ رنگ کی نظم ہے جب کہ "کیا یہ سچ ہے" اور "جیسے کچھ یاد آرہا ہے مجھے"۔ انتظار یہ

رنگ کی حامل ہیں۔نظم "سرِ نیاز جھکائے دعا مانگتا ہوں" میں نظم کے ہر مصرع کی ابتدا "کئی دنوں" کی لفظی تکرار سے شروع ہوتی ہے جس نے نظم میں زور بیاں اور لطف پیدا کیا ہے کہ صوتی آہنگ بھلا لگ رہا ہے۔وصل کی دعا کے حوالے سے اس نظم کا آخری حصہ ملاحظہ کیجیے کہ کس خوب صورتی سے وہ وصال بانٹتے لمحوں کا سامنا کرنے کے تمنّائی ہیں:

ہوائے کوچۂ دل دار! ہم نوائی کر
دعائیں مانگ
مرا عشق معتبر ٹھہرے
جو ذہن و دل میں تفاوت ہے مختصر ٹھہرے
حضورِ عشق جنوں مجھ کو سرخ رو کر دے
وصال بانٹتے لمحوں کے روبرو کر دے

یوسف خالد کی نظموں میں فکری پختگی، احساس کی شدت، اضطراب اور جذبے کی تہذیب دکھائی دیتی ہے۔وہ قدامت پرست نہیں۔وہ ماضی کا مطالعہ اُس کی افادیت کے حوالے سے کرتے ہیں۔اُن کے ہاں حال کے حوالے سے ماضی کی دریافت ہے۔روایت چوں کہ زندگی کے ارتقا کا اہم حصہ ہے۔اِس لیے اُس سے پہلوتہی ممکن نہیں۔ہم ماضی کی روایت سے بصیرت کشید کر کے اُس کی روشنی میں اپنا حال سنوار سکتے ہیں، آگے بڑھ سکتے ہیں۔"رنگ خوشبو مرا حوالہ ہے" کے خالق کے ہاں عصری شعور و آگہی نمایاں ہے۔اُس نے کئی نظموں میں بتایا ہے کہ ہمارا حال قابلِ فخر نہیں ہے لہٰذا وہ ماضی کی حسیں سماجی و معاشرتی روایات کو حال کے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔"بیتے ایام سے محبت کا ایک سبب مرحومین بھی ہیں، مجموعہ کی پہلی نظم پروفیسر غلام جیلانی اصغر مرحوم کی یاد میں لکھی گئی۔" انہوں نے ماضی کے حوالے سے جو نقش و نگار اُبھارے ہیں وہ بہاروں، چمن زاروں، موسموں، شاخساروں اور قدرت کے دل کش نظاروں کے منت کش ہیں۔اُن کی نظموں میں جس صحت مند معاشرے اور معاشرت کا تصور ملتا ہے وہ ماضی سے متعلق

ہے۔ اِس عہد کی شہری زندگی میں تو بھاگ دوڑ کی ایسی گرد اُڑ رہی ہے کہ انسانوں کی خال وخط پہچاننا مشکل ہوگیا ہے۔ بے حسی اور اجنبیت نے ہمیں بے چہرگی عطا کی ہے۔ "ضد نہ کر" سادہ اور رواں اسلوب میں لکھی گئی نظم ہے۔ شاعر نے علامتوں کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ ہمارے عہد کے ڈر، خوف، بے سکونی، انتشار اور فتنوں کو رقم کیا اور اِس کو وہ "نئے دور" کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ گھر کی چوکھٹ سے باہر قدم رکھیں تو کیسے؟ گلیاں اور کوچے مقتل بنے ہوئے ہیں۔ زندگی بے اماں ہو چکی ہے۔ جان و ایمان کے راہ زن موقع ملنے کے منتظر ہیں۔ ایسے میں مجلسی زندگی، میلے ٹھیلے، دوست احباب کی محفلیں سب خواب ہوگئی ہیں۔ کسی سے غم گساری تک نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اسلامتی کا تقاضا یہی ہے کے گھروں میں ٹھہریں مگر نظم کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اِس کا اختتامیہ رجائی لہجے میں ہوا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ دھند چھٹ جائے گی اور پردۂ غیب سے روشن سویرا ضرور طلوع ہوگا۔ گلیاں بازار، دوستوں کی محفلیں اور مجلسیں پھر سے آباد ہو جائیں گی۔ اِس لیے اچھے وقت کا انتظار کرو اور اِس خرابے میں ملاقات کی ضد نہ کرو۔ ''زندگی ہاری نہیں ہے'' بھی ایک خوب صورت نظم ہے جس میں شاعر نے زلزلے کے بعد کی کیفیت واضح کی ہے کہ جب انسان دکھ درد میں مبتلا ہوتا ہے، ہر طرف تباہی و بربادی کے خونچکاں مناظر ہوتے ہیں، زخمیوں کی چیخ و پکار ہوتی ہے لیکن پُرعزم انسان پھر زخموں کی پیوند کاری میں لگ جاتا ہے، حوصلہ نہیں ہارتا۔

نظم کا ابتدائی حصہ ملاحظہ کیجیے:

پہاڑوں کے بطن میں پلنے والی بے کلی
سر پیٹتی یوں گھر سے نکلی ہے
کہ چاروں اور ہر شے لرزہ براندام ہے
آہ و بکا ہے
زندگی کے مسکراتے خوش نما چہرے پہ
گہرے خوف کے آثار اُبھرے ہیں

اب اسی نظم کا آخری حصہ بھی ملاحظہ کیجیے اور انسان کے عزم و حوصلے کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اُس کی داد دیجیے:

مگر اک حوصلہ اس خوف کے مدمقابل آ گیا ہے
نئے احساس سے سارے زمیں زادے
زمیں کے زخم بھرنے میں لگے ہیں
آرزوئیں پھر جواں ہونے لگی ہیں
زندگی ہاری نہیں ہے

یہی کیفیت اُن نظموں مثلاً "وقت سے آگے نکلی ہوئی نظم" اور "کورونائی ماحول کی تنہائی میں لکھی ہوئی نظم" میں بھی دکھائی دیتی ہے جو اُنہوں نے کرونائی وبا کے پس منظر میں لکھی ہیں۔ مگر نظم "رائگانی" میں لہجہ قنوطی ہے کہ وہ تاریکی اور خلوت نشینی کو قبول کرتے نظر آ رہے ہیں مگر یہ انسانی نفسیات اور رویے ہیں کہ مختلف اوقات میں انسان مختلف ذہنی کیفیات سے گزر رہا ہوتا ہے جس کے اثرات یقیناً اُس کی سوچ پر مرتب ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا نظم کے ساتھ کتاب میں شامل اگلی نظم "بہت مصروف ہوں میں" کا ذکر کرنا بہت برمحل ہوگا۔ اِس معاشرتی عدم اطمینان اور عدم تحفظ کے احساس نے شاعر کو مجبور کیا ہے کہ وہ اُس عہد میں لوٹ جانے کی تمنا کرے کہ جب باہم محبتیں عام تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ بے فکری اور سکون ہی سکون تھا۔ کسی چور، قاتل یا لٹیرے کا ڈر نہ تھا۔ انسان امن و چین سے سوتے تھے۔ پیار محبت کے گیت گاتے تھے۔ گویا "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" والی کیفیت ہے۔ اِس کے لیے شاعر کہتا ہے کہ میں وقت کے کلاک کی سوئیاں پیچھے کی طرف گھمانے میں بے حد مصروف ہوں اور ابھی تو مجھے یہ کامیابی ملی ہے کہ پو پھٹنے کے وقت سے واپس نصف شب تک پہنچ گیا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ قدیم عہد کے سارے منظر پھر واپس لوٹا سکوں تا کہ ہم جی بھر کے اُن سے دوبارہ لطف اٹھا سکیں اور جو مناظر نہیں دیکھ سکے تھے اُن سے بھی حظ اٹھائیں۔ وہ وقت کی رفتار

سے نالاں ہے جو ہمیں جذباتی ہزیمتوں سے دو چار کر رہا ہے۔ اِس نظم میں دو ادوار ہمارے حال اور ماضی کا موازنہ ہے۔ یوسف خالد نے اِس نظم میں اپنے شعری افکار کے پردے میں ایک عام انسان کے محسوسات کی عکاسی کی ہے۔ ہمارے سماج اور معاشرت کی یہ سچائی ہے کہ ہم ہر گزرتے دن کے ساتھ ترقی کا سفر طے کرنے کی بجائے اپنی جذباتی زندگی میں ہر طرح کی مسرت و شادمانی سے تہی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہم وطن حال کا شکوہ کرتے اور بیتے ہوئے ایام کو یاد کر کر کے آہیں بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اپنی نظم ''بھید'' میں کہتے ہیں کہ نظامِ ہستی یہی ہے کہ کہیں پہ سکھ اور کہیں پہ دکھ ہے۔ کسی کے حصے میں جام آتا ہے اور کسی کے حصے میں پیاس آتی ہے۔ ''زندگی روٹھی ہوئی ہے'' ایک جان دار اور فکر انگیز نظم ہے جس میں شاعر نے ماضی سے حال تک کی سفر میں ہمارے ماحول، معاشرت اور رویوں میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اُن کو موضوع بنایا ہے۔ گویا واد و ادوار کے درمیان ایک خطِ تقسیم ہے ایک طرف پُر سکون زندگی ہے جو ایسے ہے جیسے پھولوں اور پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں جو شیریں ثمر بھی دیں اور خنک سایہ بھی۔ دوسری طرف وہ زندگی ہے جو تپتے صحرا کی طرح ہے بے ہنگم اور بے سکون جس میں تیز رفتاری ہے اور یہ برق پائی ہمیں اور ہمارے نازک احساسات کو کچلے جا رہی ہے۔ اوّل الذکر کو وہ ماضی اور آخر الذکر کو حال کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ نظم ''میں البم کھولتا ہوں'' بھی خوب صورت یادوں کا البم ہے جس میں دل کش ماضی سانس لے رہا ہے۔

یوسف خالد نے جس طرح سرسبز وادیوں، بہتے چشموں، فلک بوس کوہساروں، گنگناتی ندیوں، شاداب کھیتوں، پھولتی سرسوں، گُل ہائے رنگ رنگ، معطر فضاؤں کی منظر نگاری کی ہے اُس پر دیہی جنت (Arcadia) کا خیال آتا ہے۔ قدیم یونان میں پیلو پونیسے نام کا ایک قصبہ تھا۔ جہاں کے لوگ بہت سادہ مزاج اور معصوم فطرت ہوا کرتے تھے اور یہ قصبہ شہر کی مصنوعی، مکارانہ اور آلودہ زندگی سے دور تھا۔ اسے لوگ دیہی جنت کہا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے شیکسپیئر کا آرڈن کا جنگل یا ورجل کا ایکلوگز جس بے مثال عہد کی ترجمانی کی گئی ہے وہ آرکیڈیا ہی سے ماخوز ہے۔ یوسف خالد جن مناظرِ فطرت سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں وہ اُن کے آرکیڈیا ہی تو ہیں۔

اُن کی شاعری غیر نظری ہے مگر کلام میں ماضی کے کسی رجحان کی باز یافت نظر آتی ہے تو وہ منظر

نگاری ہے۔غزل میں بھی اُن کے ہاں نہ صرف موضوعات وہی نظم والے ہیں بلکہ لفظیات کا استعمال بھی ویسا ہے۔وہی فکری تناظرات،وہی فطری لہجہ،وہی رومان پروری،وہی تڑپ،وہی رت جگے،وہی خواہش وصل،وہی خواب وخیال کی سحر آفرینیاں،وہی خواب ناک کیفیات،وہی ناسٹالجیا،وہی مرحومین کی یادیں،وہی احباب کی حسین یادیں۔عقل والے یاد رکھتے ہیں مگر دل والے بھولتے نہیں۔انہیں دوستوں کی پیار بھری رفاقتیں یاد ہیں اور اِس بات کا دکھ ہے کہ یہ رفاقتیں مختصر رہیں اور ساتھ ہی اِس کی وجہ بھی بتادی کہ وقت سیماب صفت ہوگیا ہے۔اس کی برق پائی مہلت نہیں دے رہی کہ کچھ پل مزید مجلسی زندگی سے لطف اُٹھالیں۔

ہمارے ذوقِ رفاقت سے بے خبر ٹھہری
حیاتِ حلقۂ احباب مختصر ٹھہری

رکھ دی ہیں ہم نے طاق پہ ساری رفاقتیں
اب پہلے جیسی فرصتیں حاصل نہیں ہیں دوست

غزل میں بھی اسلوبِ بیاں سادہ اور رواں ہے،کوئی تکلف اور تصنع نہیں،کوئی زیادہ ملمع کاری اور صنّاعی نہیں۔علامت اور استعارے کا استعمال بھی غزل میں کم دکھائی دیتا ہے۔

مشکل بھی ہو گر بات تو مشکل نہیں رہتی
اسلوبِ بیاں اپنا ہے سادہ سے بھی سادہ

نظم ہو یا غزل،اُن کے الفاظ سے جو ایک مجموعی کیفیت جھلکتی ہے وہ یہ ہے کہ احساسات کے کئی شیڈز ہیں مگر یہ محبت ہی کے خواب ہیں جن سے اُن کے فن کا گلاب مہکا ہوا ہے۔اُن کی غزل میں محبت میں خواہش وصل،شکستہ خواب،تنہائی اور اُداسی،ہجر کے درد وغم،آنکھوں میں سجے رت جگے،محبوب ہستی سے شکوہ وشکایت گویا محبت کے سارے رنگ نمایاں ہیں۔اُن کے تخلیقی اظہار میں محبت کی چاشنی بھی ہے،گداز بھی،اضطراب بھی اور اپنی دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی۔اُن کی ایک غزل میں تو محبت کے فلسفے کی مکمل تفسیر دکھائی دیتی ہے جس میں اُن کے نزدیک محبت

بولتی آنکھوں کا تہذیبی حوالہ بھی ہے اور روح پر لکھی ہوئی کہانی بھی۔ محبت شادمانی کا احساس لیے ہوئے ہوتی ہے مگر درد میں لپٹی ہوتی ہے۔ محبت کو فنا نہیں یہ جاودانی ہے اور محبت کو تلوں اور بلبلوں کی نغمہ خوانی بھی ہے۔ محبت کے تخیل کی دنیا پر حکم رانی ہے کہ یہ اپنی مرضی کے منظر تراشتی ہے۔ محبت عارض ولب پر مچلتی شادمانی ہے اور یہ اہلِ دل کے لیے تحفہ آسمانی بھی ہے۔ اُن کے کلام میں جمالیات کے رنگ میں بھی ڈوبی ہوئی کئی غزلیات ہیں جن میں اوّل و آخر ایک سی فضا ہے۔ اُنہوں نے محبت کی بات عمومی طور پر استعاروں اور کنایوں میں نہیں کی۔ اُن کے ہاں سادہ، قابل فہم اور نکھرا ہوا اسلوبیاتی نظام ہے۔ اِس وجہ سے اُن کے ہاں کہیں بھی لہجہ غیر مانوس نہیں ہے۔ غزل کی نفاست اور نزاکت ہے۔ انہوں نے غزل کو عمر وعیار کی زنبیل نہیں بننے دیا، اُس میں صرف دل کی دھڑکنیں سموئی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آنکھوں میں اُداسی نے لگا رکھے ہیں ڈیرے
ڈر لگتا ہے ہو جائے نہ یہ ہجر زیادہ

ہم لب شکستہ لوگ تہی دست رہ گئے
گزرا قریب سے وہ سحر بانٹتا ہوا

اُس کا خیالِ جاں فزا ہے بانسری کی لے
ہے ذکر اُس کا چاندنی شب سے جُڑا ہوا

ہم نے سنبھال رکھے ہیں آنکھوں میں تیرے خواب
ہم تجھ سے تیری یاد سے غافل نہیں ہیں دوست

رکھنا ہے اُس کو ساتھ بڑے اہتمام سے
اک یادِ دلنواز کو گھر لے کے آئے ہیں

جو سپنا آنکھ میں رکھا ہوا ہے
اُسی سے میرا فن مہکا ہوا ہے

آنکھوں کی تصویر بنائی جب ہم نے
خواب بھی ساتھ چلے آئے تصویر کے ساتھ

یہ مری ویران آنکھیں، رت جگے
یہ کسی کی مہربانی ہے میاں

نہ جانے کس کے معطر بدن سے پھوٹی ہے
حسین کلیوں سے پھولوں سے کھیلتی خوشبو

محبت دھیرے دھیرے سے اُترتی ہے رگ و پے میں
محبت درد میں لپٹی ہوئی اک شادمانی ہے

محبت فاصلوں کو قید کر لیتی ہے مٹھی میں
محبت صورتِ تریاقِ رنج رائیگانی ہے

اُن کی نظم میں بھی ماضی کے حوالے سے ایک ناسٹالجیا ہے۔ وہ موجودہ عہد کی چلن سے غیر مطمئن ہیں۔ یہ اندھوں کی دوڑ اُنہیں بالکل مرغوب نہیں۔ ہماری رفتار تیز تر مگر منزل ہم سے گریز پا۔ اُن کی نظر میں اِس ارتقا نے انسان کو دکھوں اور تکلیفوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ عقل سر بہ گریباں ہے کہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اُن کی غزل کے بیشتر اشعار حسن و جمال اور عشق کی روداد اور متعلقات پر مشتمل ہیں۔ مزید براں نظموں میں دو ادوار کی زندگی کا تقابلی جائزہ ہے مگر اُن کے غزلیہ اشعار میں زندگی کی کٹھنائیوں کا ذکر بھی ضرور ملتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے کہا تھا کہ ''ہمیں خالص غزل کو عشقیہ شاعری کے مترادف سمجھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ لیکن مطالعے

سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بھی غزل موضوع کی اِس وحدانیت کو قائم نہیں رکھ سکی۔ غزل گو شعراء اشروع ہی سے زندگی کے مختلف امور و مسائل کو قلم بند کرتے رہے ہیں"۔ یوسف خالد نے کسی نہ کسی حد تک نئے دور کی اذیتیں رقم کی ہیں۔ یہ ایسا دور ہے کہ سادگی، سچائی اور دیانت دم توڑ چکی ہے۔ اقدار اور تہذیب کی شکستگی حساس دلوں کو گھائل کیے دیتی ہے۔ اُنہوں نے اہلِ ثروت کی بے حسی پر بات کی ہے جن کی بدولت دستار کی فضیلت قصہ کہانی ہو چکی ہے۔ اُن کے ہاں فراریت نہیں، اُداسی ضرور ہے شکست خوردگی یا قنوطیت نہیں۔ عزم اور حوصلے کی چراغ فروزاں ہیں۔ سماجی اور معاشرتی جبر کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے سینہ سپر ہونے کا عزم ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ موجوں اور منہ زور ہواؤں کے آگے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ میں تھوڑی دیر کے لیے ستانے کو رکا ہوں۔ ابھی میرے بال و پر نے اُڑان بھرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔

اِس دورِ ابتلا میں ہوں اُس سے مدد طلب
میں مطمئن ہوں اُس کی طرف دیکھتا ہوا

ہر نئے درد سے بن جاتا ہے رشتہ اپنا
ہر گھڑی ایک اذیت کے طلب گار ہیں ہم

دستار کی فضیلتیں بے مایہ ہو گئیں
یوں اہلِ زر نے سر پہ سجائی ہے بے حسی

بیٹھا ہوں میں ستانے ابھی ہارا نہیں ہوں
باقی ہے پرو بال میں اُڑنے کا ارادہ

تری منہ زور موجوں کے مقابل
کسی نے لمحہ بھر ہمت نہ ہاری

جناب یوسف خالد کی شاعری

شاعری کو آنکنے اور جانچنے کے زاویے متنوع ہیں: عروض و بلاغت کے اصول، اسلوب و بیان کی نزاکتیں، تاریخی و عصری شعور، نفسیاتی اور روحانی مدرکات اور دیگر متعدد معاملات ہیں جو گفتگو کے تناظرات فراہم کرتے ہیں۔ لیکن ان سب کے علاوہ کوئی شے ایسی بھی ہے جو اکتسابی و وہبی چیزوں سے ہٹ کر شعر میں تاثیر کا عنصر داخل کر دیتی ہے۔ میرے خیال میں شاعر کا خلوص اس ضمن میں بنیادی شے ہے۔ مراد یہ ہے کہ کوئی شاعر اپنی فکری و قلبی واردات سے کتنے فاصلے پر رہ کر شعر کہتا ہے۔ وہ اس سے جتنا قریب ہوگا شعر کے پُر اثر ہونے کا امکان بڑھ جائے گا۔ اقبال نے اسی حوالے سے کہا تھا کہ ''دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے''۔ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دنوں سے اب تک میں جناب یوسف خالد کی شخصیت اور اُن کی شاعری کے قریب رہا ہوں اور میں بطور ادب کے ایک طالب علم کے یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت اور ان کے شعر میں فاصلے بہت کم ہیں۔

یوسف خالد صاحب اپنی طبع میں ایک اصلاح پسند سماجی دانشور ہیں۔ نفسیات سے شغف اور شعبہ تدریس کے انتخاب نے (یہ امر دونوں طرح سے درست ہے کہ انھوں نے شعبہ تدریس کا انتخاب کیا یا شعبہ تدریس کے اربابِ بست و کشاد نے ان کا انتخاب کیا) ان کے اس طبعی میلان کو جِلا بخشی اور ان کو ایک ایسی شخصیت میں ڈھال دیا جس کی بنیادی جہات تین ہیں: سب سے پہلے ایک دلِ دردمند، اس کے ساتھ ایک بیدار و متفکر ذہن اور ان دونوں کے ساتھ ایک نطق بلیغ۔ ان کی شاعری پر نظر ڈالنے کا جو زاویہ اوپر بیان ہوا ہے اس کے اطلاق میں ان کی شخصیت کی یہ جہات معاونت کرتی ہیں اور ان کے قلبی احساس، فکری بیداری اور قوتِ ابلاغ کو ان کی شاعری میں نشان زد کیا جا سکتا ہے۔

ان کے قلبی احساسات کے تین دائرے ہیں: رومان، خلش اور صدمہ۔ ان کا رومان شخصی معاملاتِ محبت سے شروع ہو کر سماجی یوٹوپیا تک جاتا ہے۔ موجود سے عدم اطمینان تخلیقی آدمی کا

بنیادی رویہ ہے، اسی سے رومان جنم لیتا ہے جو اسے نئے اور بہتر کا خواب دیکھنے پر اُکساتا ہے۔ یوسف خالد صاحب جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہے جس کا ماضی، حال اور مستقبل پاکستان ہے یعنی انھوں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ان کا وطن پاکستان تھا، اس لیے مٹّی سے جُڑت کے حوالے سے ان کی اول و آخر محبت پاکستان سے ہے۔ وہ عمر کے جس حصے میں ہیں، اس میں محبت کے سارے زاویوں کے سرے آپس میں مل جاتے ہیں اور شخصی و اجتماعی خلشیں اور صدمات باہم آمیز ہونے لگتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ان کے رومان کے جملہ زاویے، دردِ دل سے دردِ انسانیت تک کے پہلو اور صدمے کی کیفیتیں جمالیاتی اظہار میں ڈھل کر ایک ہوتی ہیں۔ ان کے کلام میں یہ اظہاریے جا بہ جا پھیلے ہوئے ہیں جن کا تخلیقی اظہار اُن کی اس نظم میں کچھ یوں ہوا ہے۔

یہ کیسا قہر ہے

سرسوں کھلی ہوئی ہے مگر
ہوا میں دھانی چنریا نظر نہیں آتی
عجیب خوف ہے رنگیں مزاج موسم میں
خمار بخش ہوا بھی ادھر نہیں آتی
یہ کیسے موڑ پہ ہے رخشِ عمر، چاروں طرف
ہر ایک منظرِ دل کش سے رابطہ کم ہے
گھلی ہوئی ہے تخیل میں سرخوشی لیکن
قرار بانٹتے لفظوں کی آنکھ پرنم ہے

یوسف صاحب کی فکری بیداری کے بھی تین دائرے ہیں: تشخیص مسائل، امکاناتِ اصلاح، مستقبل گیری۔ فرد اور اجتماع اور حیات و کائنات سے متعلق ان کا فکر و تدبر گہرا اور مسلسل ہے۔ وہ جملہ علوم و معلومات سے استفادہ کرتے ہوئے مسائل کی تشخیص نفسی، عمرانی اور فلسفیانہ حوالوں سے

کرتے ہیں، اپنے تجربے اور تجزیے کو کام میں لاتے ہوئے مسائل کے حل کی جہات تلاش کرتے ہیں اور حال کے کُھردرے پن کو مستقبل کی مخملیں ساعتوں کے امکانات سے جا ملاتے ہیں۔

یہ نیا دور ہے اے دلِ بے خبر
معتکف ہو کے یادوں کی جانب پلٹ
اپنی یادوں کو اپنے گلے سے لگا
اس نئے دور کے سب تقاضے سمجھ
رات کٹ جانے دے، رات کٹ جائے گی
دن نکل آئے گا، دھند چھٹ جائے گی

یہ سطریں فوری طور پر تو موجود وبائی صورت حال کے تناظر میں ہیں لیکن ان کا فکری دائرہ یہیں تک محدود نہیں۔ شاعر نے اس صورت حال کے آئینے میں نئے دور میں تنہائی اور حساس انسان کی گوشہ نشینی کو مشاہدہ کیا ہے اور اس کا ایک حل تجویز کرتے ہوئے امید اور بشارت کے کُھلے دروازوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ زیرِ نظر شاعری میں بلاغت کی بھی تین فنی وجوہات ہیں: سادگی، سریع الفہم استعارے، منطقی ربط۔ ان کی نظمیں زندگی کے اُلجھاؤ کو تو بیان کرتی ہیں لیکن خود کسی اُلجھاؤ کا شکار نہیں ہیں۔ ان کی راست فکری اظہار کے بھی راست زاویے تلاش کرتی ہے۔ استعارہ سازی میں بھی انھوں نے معاصر اردو نظم کے غالب رجحان سے، جو پیچیدگی سے رغبت رکھتا ہے، الگ رہ کر ابلاغ کو مقدم رکھا ہے اور توجہ استعارات کے کومل ہونے پر رکھی ہے۔ ان کی نظمیں سیدھے سبھاؤ چلتی ہیں اور دماغ میں جگہ بنانے سے پہلے دل میں اُترتی ہیں کہ شاعری کا اصل مقام یہی ہے۔

اک پہیلی سی خوبرو لڑکی
سوچ کی وادیوں میں گم صم ہے
ذہن و دل میں پڑی ہوئی گرہیں
کس مہارت سے کس سلیقے سے
ایک ایک کر کے کھولتی ہے مگر
جب سمجھتی ہے گرہیں کھلنے سے
دل کی حالت بھی ہو رہی ہے عیاں
پھر نئی گرہیں ڈال دیتی ہے
لطف لیتی ہے اس بہانے سے
کھیل رکھتی ہے مستقل جاری
اس کے دھاگے ہیں گو بہت کچے
گرہیں لیکن کمال ڈالتی ہے

ادب سے وابستگی کی ظاہری عمر کے حوالے سے دیکھا جائے تو یوسف صاحب نے کم لکھا ہے اور اس سے بھی کم چھپوایا ہے۔ شاعری ان کے لیے شہرت و ناموری کی دوڑ میں حصہ لینے کے وسیلے سے زیادہ اظہارِ ذات کی ایک صورت رہی ہے اور وہ اس لحاظ سے اس کوشش میں کامیاب ہیں کہ ان کی شاعری کے گہرے مطالعے کا تاثر یہی قرار پاتا ہے کہ جیسے وہ خود ہیں، ویسی ہی ان کی شاعری ہے۔

عابد سیال

اک ستارے کا ہے عطا کردہ
میری آنکھوں میں جو اُجالا ہے

حسنِ احساس سے مزیّن ہوں
رنگ، خوشبو مرا حوالہ ہے

نظم محل

پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی یاد میں

وہ جس کا چہرہ
کتاب صورت

وہ
جس کی باتوں میں گفتگو کے
تمام رنگوں کی تازگی تھی

وہ
جس کے لہجے کے زیر و بم سے
شکستہ لفظوں میں جان آئی
وہ جس کی آنکھوں میں دلکشی کے
ہزار موسم چھپے ہوئے تھے

وہ
جس کے شعروں میں،
آرزوؤں کے سب نگینے جڑے ہوئے تھے

وہ
جس کی نظموں کے پیرہن پر
وفا کے نغمے لکھے ہوئے تھے
وہ دل کی بستی کا رہنے والا

وہ
مثلِ برگِ گلابِ تازہ
وہ ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا
کہ جس کے عارض پے
صبح روشن کا سارا جادو بکھر گیا تھا

ضد نہ کر

اک نیا دور ہے
ایک انجانا ڈر
اس نئے دور کے ہیں نئے فتنہ گر
اور نئے چارہ گر
ہر نگر ہر ڈگر
لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے خیر و شر
الاماں الاماں، زندگی کے لیے
کس قدر بے اماں ہو گئے روز و شب
مجلسی زندگی خواب لگنے لگی
باہمی غمگساری کے اظہار کے
جتنے رائج تھے سب طور عنقا ہوئے
ہمرہی، ہم نشینی فسانہ ہوئی
خاک زادوں پہ کیسا کڑا وقت ہے
آنکھ میں حیرتیں
روح ویران ہے
یہ نیا دور ہے

یہ نیا دور ہے اے دلِ بے خبر
معتکف ہو کے یادوں کی جانب پلٹ
اپنی یادوں کو اپنے گلے سے لگا
اس نئے دور کے سب تقاضے سمجھ
رات کٹ جانے دے، رات کٹ جائے گی
دن نکل آئے گا، دھند چھٹ جائے گی
پل رہی ہے کہیں پردۂ غیب میں
ایک صبحِ درخشاں تمہارے لیے
اے دلِ بے خبر
معتکف ہو کے یادوں سے وابستہ رہ
یہ گھڑی سخت ہے
یہ گھڑی ٹلنے دے
ضد نہ کر
اس گھڑی میں ملاقات ممکن نہیں

بہت مصروف ہوں

تواتر سے گھڑی کی سوئیاں الٹی گھمانے میں لگا ہوں
ابھی کچھ دیر پہلے
پَوہ پھٹے سے نصف شب تک کا سفر طے کر کے بیٹھا ہوں
اجالے سے اندھیرے کے نگر میں آ گیا ہوں
جو تھوڑی دیر پہلے خواب دیکھا تھا
اسے پھر بُن رہا ہوں
آنکھ بوجھل ہو رہی ہے
سوئیاں رکنے لگی ہیں
جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے
نیند اپنے ریشمی ہاتھوں سے مجھ کو تھپکیاں دینے لگی ہے
کیا کروں
میری ریاضت داؤ پر ہے
کسی صورت
مجھے ان سوئیوں کو
مستقل حرکت میں رکھنا ہے

کہ میں نے سوچ رکھا ہے
مجھے یوں ہی
مسلسل وقت کے اس جبر سے باہر نکلنے کا جتن کرنا ہے
تھوڑا پیچھے ہٹنا ہے
سفر معکوس کرنا ہے
کہ میں اس وقت کی رفتار سے تنگ آ گیا ہوں
مری آنکھیں نئے انداز سے
وہ سارے منظر دیکھنا، محسوس کرنا چاہتی ہیں
جنہیں عجلت میں بن دیکھے میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں

سب لفظ عاجز ہیں

یہ منظر کیسا منظر ہے
جو آنکھوں میں اترتا ہے
تو آنکھیں نیند کی دیوی سے ملنے کی دعا کرتی ہیں
سپنے بننے لگتی ہے
تخیّل بے نہایت وسعتوں میں پھیل جاتا ہے
مرا احساس میلوں کی مسافت کی طنابیں کھینچ لیتا ہے
کسی کو روبرو محسوس کرتا ہے
کسی کی مدھ بھری آنکھوں سے
مے خانے کی تصویریں بناتا ہے
کسی کے خال و خد کی دلکشی پہ شاعری تحریر کرتا ہے
حسیں بالوں کو چھوتا ہے
تو یوں محسوس ہوتا ہے

کہ جیسے ریشمی زلفوں کا خوشبو سے معطر لمس
ہولے سے بدن میں گھلتا جاتا ہے
نظر کے سامنے اک خوب رو چہرہ ہے
جس کی خوش نمائی سے
مری آنکھیں منور ہو گئی ہیں
مگر سب لفظ عاجز ہیں
کہ لفظوں سے محبت کرنے والے
خوش نوا شاعر کو اپنی ساحری بے معنی لگتی ہے

میں اگر آئینہ بھی ہوتا تو

وہ جو اوجھل ہے میری آنکھوں سے
کیا خبر کتنی خوبصورت ہے
کیا خبر اس کی مدھ بھری آنکھیں
اس کے ہونٹوں کی احمریں قاشیں
اس کے گالوں کی خوشنما رنگت
اس کی زلفوں کے ریشمی حلقے
اس کے پیکر کی دلنشیں قوسیں
میں فقط ان کو سوچ سکتا ہوں
ایسا لگتا ہے میری سوچوں سے
وہ کہیں بڑھ کے خوبصورت ہے
کیسے لفظوں میں ہو بیاں اس کا
چال لگتا ہے اک قیامت ہے

اس کے لہجے کی شوخیاں توبہ
گفتگو اس کی جیسے آبِ رواں
میں اگر آئینہ بھی ہوتا تو دیکھ کر اس کی خوش نمائی کو
لازماً پاش پاش ہو جاتا
میں کہ شاعر ہوں اس لیے مجھ کو
یہ سہولت ہے سوچ سکتا ہوں
میں نے سوچا ہے وہ پری چہرہ
ایک شاہکار ہے صباحت کا
خال و خد اس کے اجلے اجلے ہیں
ہونٹ مسکن ہیں مسکراہٹ کا
مجھ کو تسلیم ہے کہ لفظوں میں
اس کی تصویر بن نہیں پائی
میں مصور نہیں ہوں شاعر ہوں
رنگ لفظوں میں بھر نہیں سکتا

وہ رنگ و نور کا پیکر ہے

وہ دل نواز
وہ پھولوں سی خوبرو جس نے
مرے خیال کی وادی میں قدم رکھا ہے
وہ خامشی کے جزیرے سے لوٹ آئی ہے
اتار پھینکا ہے اس نے غموں کا بوجھ اور اب
حسین پھولوں کی وادی میں خوشبوئیں اوڑھے
وہ گنگنانے لگی ہے حسیں فضاؤں میں
بہت حسیں ہے

مہذب ہے
مثلِ خوشبو ہے
سبک خرام ہے
ہنستی ہے مسکراتی ہے
وہ اپنی اجلی مسافت پہ گامزن ہے اب
وہ خوش خصال بھی خوش رنگ خوش لباس بھی ہے
مگر وہ میرے تصور میں میرے پاس بھی ہے
وہ رنگ و نور کا پیکر ہے
مثلِ قوسِ قزح
وہ خوش کلام محبت کا استعارہ ہے

رائگانی

ہوا سے کوئی کہہ دے
بے سبب دستک نہ دے
اب اپنا رخ بدلے
کوئی تازہ ہدف ڈھونڈے
کہ ہم نے روشنی کی چاہ میں
جتنے دیے روشن کیے تھے
سب بجھا کر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں
ہمیں تاریکیاں راس آ گئی ہیں

زندگی روٹھی ہوئی ہے

ہم اک ایسے خطِ تقسیم پر محوِ سفر ہیں
جس کے اک جانب
گھنے برگد تھے
کچے راستے تھے، کچے گھر تھے
ہوا میں کچی کلیوں کی مہک تھی
دور تک پھیلی ہوئی سرسوں تھی
چرواہے تھے ریوڑ تھے

پرندوں کی حسیں ڈاریں تھیں
ڈیرے داریاں تھیں، ڈھولے ماہیے تھے
بہر سو زندگی تھی
زندگی کا ہر حوالہ تھا
مگر اس رہگزر کی دوسری جانب مسلسل شور ہے
رفتار ہے، ہنگامہ خیزی ہے
عجیب بے اطمینانی ہے
ہوا میلی ہے بدبو سے بھری ہے
دھوئیں کی ایک چادر ہے
جو زیرِ آسماں بے انت پھیلی ہے
یہاں کے موسموں میں بھی بلا کی شدّتیں ہیں
زہر ناکی ہے
یہاں پر موت ارزاں ہے
ہر اک ذی روح لرزاں ہے
یہ منظر خوف کا منظر ہے
اس میں زندگی ناپید ہے
بس زندگی کی ایک مصنوعی سی صورت ہے
جسے سب اوڑھ کر
اندھے سفر پر گامزن ہیں

ہمارا المیہ یہ ہے
کہ ہم اس دوڑ میں آگے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں
نہ رکتے ہیں نہ ہم پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں
ہمیں یہ خوف ہے کہ رک گئے تو کچلے جائیں گے
کہیں برگد نہیں
جس کی گھنی چھاؤں میں دم لے لیں
نہ کچے راستے، نہ دور تک پھیلی ہوئی سرسوں
نہ چرواہے نہ ریوڑ ہیں
فقط بے اطمینانی ہے
کہ ہم سے زندگی روٹھی ہوئی ہے

یہ ناممکن نہیں ہے

نہیں معلوم تم کیسی ہو
کیسا روپ ہے
اور کیسی لگتی ہو
تمہارے عارض و لب اور شانوں پر
بہر سو خوشنما بکھری ہوئی زلفیں
تمہاری خوبرو آنکھیں

گھنی پلکیں
تمہارے دلنشیں ابرو
جنہیں میں نے تصور میں ہی دیکھا ہے
یہ سب کیسے ہیں تم کیسی ہو
کیسے جان پاؤں گا؟
کبھی شاید
نہیں شاید
یہ ناممکن نہیں لیکن
نجانے کیوں
یہ ناممکن سا لگتا ہے

ایک مدہم روشنی ہے

مسلسل سوچتی آنکھوں کے پیچھے
خوبصورت خواب بُنتے رتجگے ہیں
آرزوئیں ہیں
نہاں خانۂ دل میں
وصل کے احساس سے سرشار ہوتی دھڑکنوں میں
اک انوکھا زیر و بم ہے
نرم بستر پر بدن کی کروٹوں نے خواہشوں کا روپ دھارا ہے
منقّش میز پر رکھے ہوئے گلدان کے پھولوں میں مستی ہے
حسیں تکیے میں انجانی سی خوشبو کا بسیرا ہے
ملائم ریشمی چادر پہ ہر سو سلوٹیں ہی سلوٹیں ہیں
مسلسل سوچتی آنکھوں میں پیہم پلنے والے خواب

تصویروں کی صورت
منظروں میں ڈھلتے جاتے ہیں
بہر سو خامشی ہے
کھڑکیوں کی چلمنوں سے چاندنی کا عکس
کمرے کے حسیں ماحول میں اترا ہوا ہے
ایک مدھم روشنی ہے
اور اس راحت فزا منظر میں دو کردار بن بولے
نہ جانے کب سے محوِ گفتگو ہیں

ریشمی ملبوس

مجھے حیرت ہے
کیسے لوگ برسوں کا تعلق توڑ کر
انجان بن جاتے ہیں سب کچھ بھول جاتے ہیں
مجھے تو ایک پل کی بھی رفاقت
بھولنا دشوار لگتی ہے
کہ میرے صحنِ جاں میں ہر تعلق
آئینہ تمثال ہے
میں جانتا ہوں آئینے نازک بدن ہوتے ہیں
اکثر ٹوٹ جاتے ہیں
اسی باعث میں بھولے سے بھی ایسا کچھ نہیں کرتا
کہ ان کو ٹھیس لگ جائے

یا ان پر گرد جم جائے
مرا احساس میری سوچ کا وہ ریشمی ملبوس ہے
جو ہر گھڑی مجھ کو
کسی کے قرب کی میٹھی حرارت دان کرتا ہے
میں آنکھیں بند کرتا ہوں
تو گزرے وقت کے سارے حسیں لمحے
کسی گلدان میں رکھے ہوئے پھولوں کی صورت
حجلۂ جاں کو معطر کرنے لگتے ہیں
میں یادوں کی حسیں راہداریوں میں
چہل قدمی کرتا رہتا ہوں

میں البم کھولتا ہوں

کوئی آواز ہے
جو شام ڈھلتے ہی سنائی دینے لگتی ہے
مرا وجدان اپنے بال و پر کو مائلِ پرواز کرتا ہے
گئے وقتوں کی اک اک قاش میں پیوست ہر اک صوت سے وابستہ
یادیں کھوجتا ہے
ذہن و دل کے کینوس پر ان کی تصویریں بناتا ہے
میں البم کھولتا ہوں
کوہساروں میں گھری وادی کے طول و عرض پہ پھیلے ہوئے
سبزے کو پلکوں پر سجاتا ہوں
نہاں خانۂ دل میں اٹھنے والا جزر و مد

بہتے ہوئے چشمے سے یوں ہم رشتہ ہوتا ہے
کہ کشتِ دل خزاں نا آشنا پھولوں کا مسکن بننے لگتی ہے
ہوا میں پھیلتی خوشبو
مشامِ جاں میں دھیرے سے اترتی ہے
مرے احساس کو مہمیز کرتی ہے
میں ڈھلتی شام کے پہلو میں بیٹھا
میز پر رکھی ہوئی فائل اٹھاتا ہوں
تو میری آنکھ میں ہر ایک منظر جاگ اُٹھتا ہے
سماعت میں رکھی آواز مدھم ہونے لگتی ہے
پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹ جاتے ہیں

اُسے خبر تھی

سفید پھولوں سے اس کو عجیب رغبت تھی
وہ خواب گاہ میں ان کو حنائی ہاتھوں سے
بڑے سلیقے سے
گلدان میں سجاتی تھی
وہ نیند آنے سے پہلے
سفید پھولوں سے
حریم جاں میں بدلتے ہوئے تقاضوں کا
بصد نیاز تواتر سے ذکر کرتی تھی
اسے خبر تھی

کہ یہ پھول اپنے دامن میں
بہت سے بھید لیے
شاخ پر نکلتے ہیں
وہ جب بھی پھولوں سے کرتی تھی ذکرِ خوابِ حسیں
خوشی سے اس کے حسیں گال تمتماتے تھے
سنا ہے اب بھی وہ پھولوں سے پیار کرتی ہے
بس اتنا فرق ہے پھولوں کا رنگ بدلا ہے
سفید پھولوں نے پہنا ہے شوخ سرخ لباس
سیاہ زلفوں کی زینت بنے ہیں سرخ گلاب
اب اس کے گالوں کا، پھولوں کا رنگ ایک سا ہے

اُسے مجھ سے شکایت ہے

وہ طعنہ زن ہے مجھ پر اور میری شاعری پر
اسے مجھ سے شکایت ہے کہ میں
حد سے زیادہ حسن کی تعریف کرتا ہوں
مجھے کوئی بتائے
میں کسی بھیدوں بھرے، خوش رنگ، خوشبو بانٹتے
اک نرم و نازک پھول کو گر خوب صورت پھول کہتا ہوں
تو اس میں کیا برائی ہے
مجھے رنگوں سے خوشبو سے محبت ہے
تو اس میں حرج ہی کیا ہے
مجھے معلوم ہے کہ زندگی میں
ہر طرف بکھرے ہوئے دکھ درد بھی

تحریر میں لانا ضروری ہیں
مگر میں کیا کروں
کہ میری آنکھیں خوبصورت منظروں سے
ہر گھڑی ہر لمحہ
جو رعنائیاں میرے قلم کو سونپتی ہیں
میں انہیں رعنائیوں کو رقم کرتا ہوں
انہیں قرطاس کی زینت بناتا ہوں
میں اتنا جانتا ہوں
چار سو پھیلے ہوئے دکھ درد جتنے بھی زیادہ ہوں
انہیں ہم باہمی احساس سے کم کر بھی سکتے ہیں
اسی باعث میں خوشیاں بانٹتا ہوں
خوشبوئیں تقسیم کرتا ہوں
حسیں موسم، سجل کھلتی ہوئی کلیاں، دھنک کے رنگ
اُجلی دھوپ، کھلتی چاندنی
اور مستقل اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بادِ صبا
پھولوں کی نازک پتیوں پر رقص کرتے اوس قطرے
شاخساروں پر چہکتی ننھی چڑیاں
پھول سے بچوں کی آنکھوں میں دمکتے خواب
بل کھاتی ہوئی شفاف ندیاں، آبشاریں،

سبزہ و گل سے مزّین کوہساروں کے حسیں موسم
یہ سب منظر مرے احساس کو مہمیز کرتے ہیں
میں کیسے چار سو پھیلی ہوئی رعنائیوں سے
اپنا رشتہ توڑ لوں
اور حسن کی تحسین سے پہلو تہی کر لوں

بالکونی میں نیا موسم اُترتا ہے

شبِ مہتاب ہے
ہر ایک منظر چاندنی کے سحر میں ڈوبا ہوا ہے
کسی کے ارغوانی خال و خد
روشن جبیں
اور نیم وا آنکھوں پہ جھالر سی بناتی ریشمی پلکیں
بھرے شانوں پہ بکھرے خوبصورت بال
سندر ابروؤں کی قوس
ہونٹوں پہ حیات افروز کھلتی مسکراہٹ
نرم رو گفتار میں پلتی ہوئی اپنائیت
اور رس بھرا لہجہ
مناظر میں بسی گہری خموشی توڑتا ہے
بالکونی میں نیا موسم اُترتا ہے
حنائی انگلیاں جب ساز کے تاروں کو چھوتی ہیں

تو ہر شے جاگ اٹھتی ہے
کسی کے مرمریں کومل بدن میں
چاندنی گھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
ہوا پھولوں سے خوشبو، اوس قطروں سے نمی لے کر
بہر سو راحتیں تقسیم کرتی پھر رہی ہے
منقش میز پر رکھے ہوئے کافی کے مگ
اک داستاں تحریر کرنے میں لگے ہیں
عجب منظر ہے جس کا لمس
میرے خواب کی پوروں میں اترا ہے
مری آنکھیں مرے اس خواب سے ہم رشتہ رہتی ہیں
شبِ مہتاب میں جب شبنمی کرنیں زمیں کا بوسہ لیتی ہیں
تو میری آنکھ میں سارے مناظر لوٹ آتے ہیں

مجھے بولنا نہیں

خوشبو کی بات ہے نہ اب رنگوں کی بات ہے
پھولوں کا ذکر ہے نہ کہیں چاندنی کی بات
سب لفظ اپنے معنی و مفہوم کھو چکے
جگنو، ستارے، تتلیاں
آنکھوں میں اترے خواب
سب دفن ہو گئے ہیں مرے ساتھ

اور میں
اک چپ میں منتقل ہوں
مجھے بولنا نہیں
شکوہ کسی کو تھا کہ بہت بولتا ہوں میں
کہہ دو اسے کہ خوش رہے
اور مطمئن رہے
چپ کر گیا وہ شخص
بہت بولتا تھا جو

نئی افتاد

جو ہجرت کر گئی تھیں فاختائیں
وہ لوٹ آئی ہیں یہ پیغام دینے
یہ گرتی آبشاریں، بہتے چشمے
یہ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں
یہ خوبصورت وادیوں میں جھومتے لہراتے دریا
یہ کہساروں کا ماتھا چومتا سبزہ
گھنے جنگل
یہ صحراؤں میں ہر سو ٹوٹتے بنتے ہوئے ٹیلے
یہ خوشبو سے بھرے پھولوں کی بیلیں
یہ رنگوں کی صباحت سے مزیّن تتلیاں
یہ چہچہاتی ننھی چڑیاں
خوبصورت گیت گاتی کوئلیں
یہ خوش نما منظر
یہ سب چھوٹے بڑے گہرے سمندر
زمیں پر بسنے والوں کا اثاثہ ہیں
زمیں کے رزق میں حصہ ہے سب کا

زمیں سب کی ہے سب وارث ہیں اس کے
مگر یہ کیا
ہوس کا جال پھیلا کر زمیں زاد
اصولوں سے بغاوت کر رہے ہیں
امانت میں خیانت کر رہے ہیں
زمیں کے امن کو تاراج کر کے
یہ دہشت کی حمایت کر رہے ہیں
کسی صورت انہیں سمجھایا جائے
یہ پاگل کیا حماقت کر رہے ہیں
نئی افتاد ان کے روبرو ہے
کوئی تدبیر کام آتی نہیں ہے
سبھی اک دوسرے سے ڈر رہے ہیں
سمجھ جائیں تو شاید بچ بھی جائیں
یہ ناسمجھی کے ہاتھوں مر رہے ہیں

بھید

"تمام دکھ ہے تمام دکھ ہے"
(یہ بات گوتم نے کیسے کہہ دی
تمام دکھ ہے)
یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے سب
یہ مرنے جینے کا سلسلہ ہے
کہیں پہ دکھ ہے کہیں پہ سکھ ہے
اسی سے قائم ہے نظم سارا
اس میں سارے ہیں بھید مخفی
جو سکھ نہیں ہے
تو دکھ نے پہچان کیسے پائی
یہی حقیقت ہے زندگی کی
"کسی کے حصے میں جام آیا"
"کسی کے حصے میں پیاس آئی"

یونس خیال کے لیے

تم مسافر تھے
تمہیں درپیش تھا ایسا سفر
جس کے ہر رستے پہ کالی رات کے عفریت تھے
تم اکیلے تھے تمہیں یہ فیصلہ کرنا تھا
ڈر کو اوڑھ لوں یا
اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر کے قدم آگے بڑھاؤں
تم عجب دوراہے پر تھے
راستے پہ ان گنت صدیوں کی پھیلی دھند تھی اور
چلنے والوں کے نشاں باقی نہ تھے
تم نے گہری دھند کے اس پار جانے کا ارادہ کر لیا
اور منزل بانٹنے والے کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا
میں مسافر ہوں مجھے اذنِ سفر درکار ہے
تم سفر پر چل پڑے اور راستے کی دھند چھٹنے لگ گئی
آج جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے

یاد آتی ہے تمہاری بے کلی، بے تابیاں اور نیم وا آنکھوں میں
ان دیکھے جہانوں کی حسیں پرچھائیاں
یاد ہے مجھ کو تمہارا دیر تک کھوئے ہوئے رہنا،
قلم دانتوں میں لے کر سوچنا اور نظم کی بنیاد رکھنا
یاد ہے اب تک مجھے سب یاد ہے
یاد ہے
گزرے ہوئے اچھے برے سارے دنوں کی سرگزشت
یاد ہے گزرا ہوا ہر ایک لمحہ یاد ہے
یاد ہے مجھ کہ تم
رات کے پچھلے پہر لکھتے تھے اپنی داستاں
میں تمہاری داستاں کا اولیں شاہد بھی ہوں، قاری بھی ہوں، ناقد بھی ہوں

زندگی زندگی کو مل جائے

ایک پیکر ہے خوشبوؤں جیسا
جب بھی آتا ہے وہ خیالوں میں
نیم خوابیدہ سی کوئی خواہش
کرنے لگتی ہے بے قرار مجھے
میرا احساس
میرے لفظوں میں صورتِ نظم ڈھلنے لگتا ہے
آنکھ خود سے تراش لیتی ہے
ایسا منظر کہ جس کی رعنائی
اس کی جلوہ گری کی زینت ہو
ایسی وادی کہ جس میں اس کے لیے
آبشاریں ہوں، سبزہ و گل ہو
ایسے رستے کہ جن کے دونوں طرف
دور تک خوشنما درختوں پر
چہچہاتے ہوئے پرندے ہوں

شام ڈھلنے پہ ان درختوں پر ایک میلہ لگا ہوا سا ہو
پوری وادی ہو منتظر اس کی
رات مہکے تو کہکشائیں بھی
اس کی تابانیوں کو مس کرنے
باری باری زمین پر اتریں
چاندنی شب میں جب وہ اٹھلاتا
گھر سے نکلے تو چاند چھپ جائے
ایسے عالم میں ان گنت جگنو اس کے عارض پہ روشنی واریں
خوشبوئیں اس کا جب طواف کریں
پوری وادی کا حسن کھل اٹھے
آرزوؤں کا ہو جہاں آباد
زندگی زندگی کو مل جائے

کسی صورت

اگر مجھ کو بھلانا ہے
تو میرا مشورہ یہ ہے
کہ میرے ساتھ تم نے
جتنے پل
مل کر گزارے ہیں
انہیں اک بھول کہہ دو تم
مجھے دل سے برا جانو
جو رشتہ باہمی احساس سے
ہنستے ہوئے مل کر کیا ہے طے کسی صورت
مرے احساس کو اس راستے کی دھول کہہ دو
اور خود کو سرخرو کر لو

گرہیں

اک پہیلی سی خوبرو لڑکی
سوچ کی وادیوں میں گم سم ہے
ذہن و دل میں پڑی ہوئی گرہیں
کس مہارت سے کس سلیقے سے
ایک ایک کر کے کھولتی ہے مگر
جب سمجھتی ہے گرہیں کھلنے سے
دل کی حالت بھی ہو رہی ہے عیاں
پھر نئی گرہیں ڈال دیتی ہے
لطف لیتی ہے اس بہانے سے
کھیل رکھتی ہے مستقل جاری
اس کے دھاگے ہیں گو بہت کچے
گرہیں لیکن کمال ڈالتی ہے

نظامِ ہستی

اشہبِ وقت ذرا دیر کو رک
مجھ کو یہ گیند تھما، میں اسے الٹا گھما کر دیکھوں
کیسے دریا میں ہوا غرق وہ لشکر جس کو
اپنا سردار جہاں بھر کا خدا لگتا تھا
زعم کتنا تھا اسے مالکِ کل ہونے کا
کس قدر اس کو بھروسہ تھا کہ اس کی قوّت
کرۂ ارض پہ جو چاہے وہ کر سکتی ہے
کس طرح اس کا تکبر خس و خاشاک ہوا
کس خجالت سے گزر کر اسے احساس ہوا
ہے کوئی اور جو ہے قوت و ہیبت والا
ہے کسی اور کے قبضے میں نظامِ ہستی
ہے کوئی اور جو غالب بھی ہے قادر بھی ہے مختار بھی ہے
ہے وہی سارے جہاں کا خالق
ہائے اک جھوٹے کو تسلیم کی مہلت نہ ملی

بیچ دریا کے اسے موت نے لاچار کیا
عہدِ موجود کے بھی جھوٹے خدا سوچتے تھے
ہم بدل سکتے ہیں اس کرۂ ارضی کا نظام
ایک انہونی ہوئی، کھیل کی بازی پلٹی
بادِ صرصر کی طرح پھیل گیا خوفِ بلا
ہنستے بستے ہوئے شہروں میں گلی کوچوں میں
موت کے عفریت نے پنجے گاڑے،
ایک ان دیکھے عدو کے ہاتھوں
ہو گیا زیر و زبر عالی دماغی کا غرور
اشہبِ وقت ذرا دیر کو رک
اک نئے عہد کی بنیاد مجھے دیکھنے دے

جیسے کچھ یاد آ رہا ہے مجھے

اس کے ہونٹوں پہ
ایک چپ سی ہے
میری آنکھوں میں ایک حیرت ہے
ایسا لگتا ہے اجنبی ہیں ہم
اس سے پہلے کہیں ملے ہوں گے
پہروں باتیں بھی ہم نے کی ہوں گی
نیند کو الوداع کہا ہو گا
رات آنکھوں میں کاٹ دی ہو گی
بات بے بات لڑ پڑے ہوں گے
اس نے منہ پھیر کر کہا ہو گا
جائیے مجھ سے بات مت کیجئے
آپ کو نیند آ رہی ہو گی
نیند شاید بہت ضروری ہے
اس کی باتوں کی گونج ہے ہر سو
اس کے لہجے میں اک اداسی ہے
اور اداسی میں ایک اپنا پن
گہری چپ میں چھپا ہوا سا ہے

ایسا لگتا ہے خواب تھا کوئی
تم کہو خواب تھا؟
نہیں تھا نا
آؤ
اک بار آ کے دیکھو تو
میری آنکھوں میں یہ نمی کیا ہے
جیسے کچھ یاد آ رہا ہے مجھے
جیسے بیتے دنوں کی چوکھٹ پہ
آج بھی کوئی منتظر ہے مرا
جیسے کوئی بلا رہا ہے مجھے
کیا یہ سچ ہے؟
مجھے بتاؤ نا
میرے الفاظ مجھ سے روٹھے ہیں
آؤ مل کر انہیں مناتے ہیں
پھر کہانی کوئی سناتے ہیں
مل کے ہنستے ہیں مل کے گاتے ہیں
آ بھی جاؤ کہ موسم گل بھی
بس تمہارے ہی انتظار میں ہے

اعتراف

آ کسی روز رازداری سے
ایک دوجے کے کان میں کہہ دیں
ہم محبت کی رہگزر پہ ہیں
ہم نے تا عمر ساتھ رہنا ہے
رنگ خوشبو کو اوڑھنا ہے مگر
ہنس کے کانٹوں سے بھی گزرنا ہے
آ کہ اس راز کے تقدس کو
اپنی روحوں میں منتقل کر لیں

زندگی ہاری نہیں ہے

پہاڑوں کے بطن میں پلنے والی بے کلی
سر پیٹتی یوں گھر سے نکلی ہے
کہ چاروں اُور ہر شے لرزہ براندام ہے
آہ و بکا ہے
زندگی کے مسکراتے خوشنما چہرے پہ
گہرے خوف کے آثار ابھرے ہیں
بہر سو گرتی دیواروں کے نیچے بے بسی بے چارگی کی داستانیں
بے ثباتی کے تصور کو عیاں کرنے لگی ہیں
زمیں کا سینہ شق ہے
آرزوئیں زخم خوردہ ہیں
مگر اک حوصلہ اس خوف کے مدِمقابل آگیا ہے
نئے احساس سے سارے زمیں زادے
زمیں کے زخم بھرنے میں لگے ہیں
آرزوئیں پھر جواں ہونے لگی ہیں
زندگی ہاری نہیں ہے

سرِ نیاز جھکائے دعائیں مانگتا ہے

کئی دنوں سے کوئی مخمصوں کی زد میں ہے
کئی دنوں سے کوئی بے قرار پھرتا ہے
کئی دنوں سے گھنے پیڑ پر ہے خاموشی
کئی دنوں سے پرندوں کے دَل نہیں اترے
کئی دنوں سے مناظر پہ دھند چھائی ہے
کئی دنوں سے شفق رنگ ملگجی سا ہے
کئی دنوں سے اداسی بنی ہے پہرے دار
کئی دنوں سے کوئی قہقہہ نہیں گونجا
کئی دنوں سے گریزاں ہیں خواب آنکھوں سے
کئی دنوں سے شبستاں میں ہُو کا عالم ہے
کئی دنوں سے کوئی رت جگوں کی چوکھٹ پر
سرِ نیاز جھکائے دعائیں مانگتا ہے
دل و دماغ میں اے کاش صلح ہو جائے
دل و دماغ کے مابین جنگ جاری ہے

یہ دیکھنا ہے کہ اب جیت کس کی ہوتی ہے
دعا بدست کوئی روز و شب کے میلے میں
ہوائے کوچۂ دلدار سے مخاطب ہے
ہوائے کوچۂ دلدار! ہم نوائی کر
دعائیں مانگ
مرا عشق معتبر ٹھہرے
جو ذہن و دل میں تفاوت ہے مختصر ٹھہرے
حضورِ عشق جنوں مجھ کو سرخرو کر دے
وصال بانٹتے لمحوں کے روبرو کر دے

سوچ کا آزار

سوچتا ہوں کیا لکھوں
اپنے دل کی دھڑکنوں کا زیر و بم،
دم بدم بنتی بگڑتی صورتوں سے منسلک
آدھے ادھورے رابطوں، بے کیف لمحوں،
مضمحل احساس کی درماندگی،
ٹوٹے ہوئے وعدوں کی کوئی داستاں
یا ذات سے باہر
بہر سو مستقل پھیلے ہوئے خدشات
اور خدشات کی زد میں
گھری مخلوق کی بے تابیاں، محرومیاں،
دہشت زدہ ماحول میں پلتی ہوئی نسلوں کا پیہم اضطراب
یا پرندوں کی حسیں چہکار،

کھلتے موسموں کے رنگ،
خوشبوئیں،
خزاں نا آشنا سر سبز بیلوں سے مزیّن
صحن کی دیوار سے لپٹے ہوئے اچھے دنوں کے خواب،
آنکھوں کے منور آئینوں میں عکس ہوتی خواہشیں
اور خواہشوں کی اوٹ سے
دزدیدہ جذبوں کی عیاں ہوتی ہوئی
مہکار کا احوال لکھوں
یا ہمیشہ کے لیے سب کچھ بھلا کر
خامشی کو اوڑھ لوں
عزلت نشیں ہو کر
مسلسل سوچنے کے کرب سے آزاد ہو جاؤں
میں کیوں نہ لفظ کے اسرار سے بے گانہ ہو جاؤں

عجب مستی کا عالم ہے

رقص گاہ ہے
دائرے ترتیب سے کھینچے ہوئے ہیں
رقص جاری ہے
ہر اک رقاص اک رفتار سے
اپنے معیّن دائرے میں رقص کرتا ہے
نہ تھکتا ہے نہ رکتا ہے
مسلسل رقص کرتا ہے
عجب مستی کا عالم ہے
سبھی رقاص اپنی ذات کے مرکز پہ پیہم رقص کرتے
دوسرے رقاص کی تحسین کرتے
جھومتے گاتے ہوئے
اک دوسرے کے گرد بھی چکر لگاتے ہیں
یہ کیسا رقص ہے
جوان گنت صدیوں سے گہرے بھید میں ملفوف
دھرتی کے ہر اک ذرے میں جاری ہے
یہ کیسا رقص ہے

اُدھورا خواب

کیسے سمجھاتے اسے کہ خواہشیں
صورتِ کچا گھڑا ہیں
ناقۂ لیلیٰ ہیں
مجنوں کی قبا ہیں
جھنگ کا بیلا ہیں
گہری نیند، ٹوٹے تیر ہیں
کیچ اور بھمبھور تک پھیلے ہوئے صحرا پہ قدموں کے نشاں

حاصل و لاحاصلی کے درمیاں
اک ادھورا خواب ہیں
اور زندگی
یہ خواب آنکھوں میں سجائے
شام کی پلکوں پہ لکھی
ایک ان دیکھے سفر کی کچھ کہی کچھ ان کہی
بھیگی ہوئی تحریر ہے
کیسے سمجھاتے اسے

وقت سے آگے نکلی ہوئی نظم

کرونا کے دنوں کی بات ہے، ہم
گھروں میں قید تھے
اور گھر سے باہر کی فضا میں
ناگہانی موت کے امکانی خدشے
ہر گلی ہر موڑ پر
یوں دہشتیں پھیلا رہے تھے
کہ ہم اپنے گھروں میں بھی ڈرے سہمے ہوئے تھے

کہیں سے بھی کوئی اچھی خبر سننے کو ملتی تھی
تو پیہم خوف سے بجھتی ہوئی آنکھوں میں
پھر سے زندگی لَو دینے لگتی تھی
مگر جب دوسرے لمحے
جہاں بھر سے مسلسل موت کی خبریں کسی چینل سے
بریکنگ نیوز کی صورت
نظر کے سامنے تصویر ہوتی تھیں
تو یوں لگتا تھا
جیسے موت کے اس وحشیانہ وار کو ناکام کرنے کی
کوئی صورت نہیں ہے
بساطِ ارض پر ہر سو بھیانک منظروں کی لوح پر لکھی ہوئی
مجبور انسانوں کی لاکھوں داستانیں
زرد پتوں کی طرح بکھری پڑی تھیں
بہر سو بھوک تھی
بے چارگی تھی
وسوسے تھے
زمیں زادوں کی نظریں جانبِ افلاک اٹھتی تھیں
تو خالی لوٹ آتی تھیں
یوں لگتا تھا دعاؤں میں اثر باقی نہیں ہے

کہیں بھی کوئی چارہ گر نہیں ہے
مسلسل بے یقینی بڑھ رہی تھی
زمیں پر حکمرانی کا تصور اس قدر دھندلا گیا تھا
کہ ہر جابر حکمراں چاہتا تھا
کوئی دروازہ کھلے ، پردہ اُٹھے
احساس کی بے جان چادر پر
کسی آواز کا عکسِ حسیں ابھرے
محبت سے بھرے لہجے میں کوئی بول اٹھے
اے مری مخلوق!
میری ذات سے مایوس مت ہونا
کرونا کے دنوں کی بات ہے یہ
نئے انداز سے بندہ و آقا کا تعلق بن رہا تھا
تکبر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا
سرِ تسلیم خم کرنے کی خو بڑھنے لگی تھی
سوچ میں تبدیلیاں آنے لگی تھیں
خدائے لم یزل نے خاک زادوں سے بلائیں ٹالنے
پھر سے انہیں احساس کی دولت عطا کرنے کی خاطر
کُن کہا
اور دیکھتے ہی دیکھتے کھلتے ہوئے پھولوں کے عارض پر

حیاتِ نو کے اجلے نقش ابھرے
بے یقینی کے اندھیرے چھٹ گئے
پھر سے زمیں پر رنگ، خوشبو، سر، محبت میں گندھے جذبے
دلوں کی بارگہہ میں
حاضری دینے لگے
اور زندگی پھر سے حسیں خوابوں کو سینے سے لگائے
خاک زادوں میں تبسم بانٹتی، اٹھکیلیاں کرتی
نئے موسم کے استقبال کو نکلی
بہر سو پھول کھل اٹھے

کرونائی ماحول کی تنہائی میں لکھی گئی نظم

تمدن کے دریچوں پر
عجب اک رائگانی
دستکیں دیتی
سحر نا آشنا آنکھوں میں ٹوٹے خواب کے اثرات کو
تقسیم کرتی پھر رہی ہے
وہ آنکھیں جن میں پیہم خواب پلتے تھے
وہاں اب خاک اڑتی ہے
مناظر دھند میں لپٹے ہوئے ہیں
بے یقینی خوف کے ماحول میں
پہلے سے زیادہ ہے
بساطِ ارض پر سب بستیوں میں
بھوک کے عفریت کی فرماروائی ہے
پرانی تمکنت مسمار ہوتی جا رہی ہے

نئی صورت گری ہے
سب پرانے بت گرائے جا رہے ہیں
رفاقت سے تہی ماحول میں
اب جسم و جاں کا ربط بھی بے معنی لگتا ہے
مسلسل ایک ہاؤ ہُو ہے

ہر سو وسوسے ہیں
الجھنیں ہیں
ایسا لگتا ہے کہ فطرت
اک نئے منشور کو ترتیب دینے میں لگی ہے
نئی صبحیں، نئی شامیں کہیں پر پل رہی ہیں

الوداعی رقص

شام
دریا کا کنارہ
ڈوبتے سورج کی حدّت سے تہی کرنوں کا سطحِ آب پر
اک مضمحل سا الوداعی رقص
تاحدِ نظر دم توڑتے رنگِ شفق پر دھیرے دھیرے پھیلتا
اور شام کی تکمیل کرتا ملگجی سایہ
پرندوں کی گھروں کو لوٹتی، ڈاریں
سکوں سے آشنا ہوتی ہوئی لہروں میں پلتی خامشی
احساس میں بے نام کیفیت جگاتے
ٹوٹتے مدوجزر
انگڑائیاں لیتے ہوئے گرداب
خواہش کی طرح پھیلے ہوئے پیڑوں کے لمبے سائے
مستی سے بھری ٹھنڈی ہوا

اور نیم جاں جسموں کو سہلاتا ہوا گہرا سکوت
ساحلِ دریا کی ٹھنڈی ریت
ہر سو ریت پر بکھرے ہوئے
کچھ ان کہے لفظوں میں لکھی داستاں کے نقش
دن بھر کی مشقت سے تھکے ہارے ہوئے ملاح
اُن کی کشتیاں اور
کشتیوں میں بے اماں آدھے ادھورے خواب
سب کچھ کس طرح
اور کتنی جلدی
رات کی تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے

چلو رختِ سفر باندھیں

ترے تسلیم کرنے سے
مرے تسلیم کرنے سے
بظاہر کچھ نہیں ہو گا
مگر تسلیم کرنے سے
ہمارے درمیاں بے نام سا جو بھی تعلق ہے
اسے احساس کی خوشبو معطر کر تو سکتی ہے
دلوں پہ ناروا جو بوجھ ہے کم ہو تو سکتا ہے
چلو تسلیم کر لیں ہم
یہ سارے رنج و غم، سب خواب، ساری راحتیں،
سارے حسیں موسم ہمارے ہیں
ہماری سوچ وادی میں
یہ سندر آبشاریں، اُجلے چشمے، گنگناتی ندیاں
بہتے ہوئے منہ زور دریا بھی ہمارے ہیں
چلو تسلیم کر لیں ہم

ہمارے خواب سندر بستیاں آباد کرنے کی
ہمیں ترغیب دیتے ہیں
ہماری ذات کی پہنائیوں میں پلنے والے خوبرو جذبے
محبت کے طلسمی در پہ اذنِ حاضری کے منتظر ہیں
ہمیں اس بھیڑ سے باہر نکل کر
حریری پیرہن کو زیبِ تن کرنا ہے
خوشبو میں نہانا ہے
ہمیں اس مختصر سی زندگی میں
اپنے حصے کی سبھی خوشیوں کا استقبال کرنا ہے
ہمیں چشمِ تصور سے یہ منظر دیکھنے ہیں
دیکھ کر محسوس کرنے ہیں
چلو رختِ سفر باندھیں
ہمیں اس رائگاں سلوٹ زدہ ماحول سے باہر نکلنا ہے

مسائل کی گرہیں کیسے کھلیں

بساطِ ارض پر
فطرت کی بوقلمونیاں
جلوہ فگن ہیں
کہیں جنگل، کہیں صحرا، کہیں بیلے
کہیں منہ زور دریا ہیں
کہیں گہرے سمندر ہیں
کہیں کہسار ہیں
جن کے بطن سے پھوٹتے چشمے ہیں
سندر گنگناتی آبشاریں ہیں

کہیں شفاف ندیاں وادیوں میں
کھلتے پھولوں، ننھی کلیوں میں
نمو تقسیم کرنے کی ریاضت میں مگن ہیں
اور اک جانب
حیاتِ جاں فزا کے لطف سے محروم
ہم ہیں اور ہم پر کُھل چکا ہے
کہ ہمیں اپنے مسائل سے کبھی بھی رستگاری مل نہیں سکتی
مسائل کی گرہیں کیسے کھلیں گی
ہم نے یہ گرہیں مسلسل ڈالتے رہنے میں
اپنی عمر کی پونجی گنوائی ہے
مسائل سے ہمارا رابطہ کافی پرانا ہے
مسائل سے جڑے سب درد و غم
ہم کو عزیز اتنے ہیں کہ ہم نے
سجل سینے کی بھٹی میں انہیں رکھ کر
سلگنے کے لیے
تن کی حرارت دان کر دی ہے
مسائل کے سلگنے اور اس نیم آتشہ
ماحول سے اٹھتے ہوئے کالے دھوئیں کو
خوش دلی سے خواب کے سارے مناظر میلے کرنے

اور
صباحت آشنا احساس کو پامال کرنے
آس کی پگڈنڈیوں پہ اگنے والے سبزہ و گل کو
ہمیشہ کے لیے ناپید کرنے کا خصوصی اذن بخشا ہے
ہمیں اب رنگ، خوشبو، سر
لطافت سے بھری رعنائیاں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں یہ الجھنیں، بے تابیاں
اور مستقل آزار کی سب صورتیں راس آگئی ہیں

اُدھوری سرخوشی

ہم اپنی روح میں اترے ہوئے
سب موسموں کا حال
لکھنا چاہیں بھی تو لکھ نہیں سکتے
کہ ہر موسم نئے انداز سے یلغار کرتا ہے
بدن کی سرزمیں پر
اک نئے احساس کی بنیاد رکھتا ہے
رگوں کی اضطرابی کیاریوں میں
خواہشوں کے بیج بوتا ہے
ہوا کے نرم روجھونکوں سے خواہش کے بطن سے

پھوٹنے والے حسیں پھولوں کا استقبال کرتا ہے
بدن کی بھربھری مٹی میں خوشبو گھولتا ہے
روح کو سرشار کرتا ہے
مگر یہ کیا کہ موسم کے بدلنے سے
رگوں سے روح تک پھیلا ہوا خوشبو بھرا منظر
بدلنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے
ادھوری سرخوشی
لاحاصلی کی زرد چادر اوڑھ لیتی ہے
ہم ایسے میں بھلا کیسے
کسی خواہش کی انگلی تھام کر
تیور بدلتے موسموں کی کوکھ سے تخلیق ہوتی
نیم جاں، بے نام، بے چہرہ
کسی آسودگی کو حرزِ جاں کر لیں

دکھ

یہ کیسا قہر ہے
سرسوں کھلی ہوئی ہے مگر
ہوا میں دھانی چنریا نظر نہیں آتی
عجیب خوف ہے رنگیں مزاج موسم میں
خمار بخش ہوا بھی ادھر نہیں آتی
یہ کیسے موڑ پر ہے رخشِ عمر، چاروں طرف
ہر ایک منظرِ دل کش سے رابطہ کم ہے
گھلی ہوئی ہے تخیّل میں سرخوشی لیکن
قرار بانٹتے لفظوں کی آنکھ پرنم ہے

شہرِ غزل

درونِ صحنِ شناسائی پھیلتی خوشبو
سنا رہی ہے کہانی یہ بولتی خوشبو

نہ جانے کس کے معطّر بدن سے پھوٹی ہے
حسین کلیوں سے پھولوں سے کھیلتی خوشبو

اُتر رہی ہے سلیقے سے میری سانسوں میں
یہ خامشی کے لبادے سے جھانکتی خوشبو

میں بے سبب نہیں بیٹھا ہوں کھول کر کھڑکی
گلی کے موڑ پہ دیکھی ہے ڈولتی خوشبو

گزر رہی ہے عجب شانِ بے نیازی سے
ہر ایک بند دریچے کو کھولتی خوشبو

میں چاندنی میں نہایا ہوا ہوں اور مجھ میں
سمٹتی جاتی ہے اک لطف بانٹتی خوشبو

آ کر لیں کسی طور محبت کا اعادہ
مدت ہوئی پہنے ہوئے خوش رنگ لبادہ

آنکھوں میں اداسی نے لگا رکھے ہیں ڈیرے
ڈر لگتا ہے ہو جائے نہ یہ ہجر زیادہ

مشکل بھی ہو گر بات تو مشکل نہیں رہتی
اسلوبِ بیاں اپنا ہے سادہ سے بھی سادہ

تم دیکھو مجھے پیار سے میں بھی تمہیں دیکھوں
کیا حرج ہے ہو جائے جو اس طور افادہ

ہم کر نہیں پائیں گے بیاں اس کی لطافت
تھا لطفِ ملاقات توقع سے زیادہ

کیا ان سے کریں دل کی کوئی بات کہ جن کا
احساس سلامت ہے نہ ہے ظرف کشادہ

بیٹھا ہوں میں سستانے ابھی ہارا نہیں ہوں
باقی ہے پر و بال میں اڑنے کا ارادہ

طلب میں تھی عجب بے اختیاری
ذرا بھر بھی نہیں تھا خوف طاری

جنوں کو اوڑھ کر نکلا تھا کوئی
طبیعت میں تھی گرچہ خاکساری

تو دریا تھا تجھے معلوم کب تھا
جدائی کس قدر ہوتی ہے بھاری

تری لہریں منگلتی جا رہی تھیں
کسی کچے گھڑے کی بے قراری

ترے پانی گواہی دے رہے تھے
کہ وقتِ شام اک ماتم تھا جاری

کہیں کوئی کسی کا منتظر تھا
فضا پر تھی مسلط سوگواری

تری منہ زور موجوں کے مقابل
کسی نے لمحہ بھر ہمت نہ ہاری

ہے اب تک ضوفشاں لوحِ وفا پر
کسی کچے کی پختہ حسن کاری

وہ صورتِ گلاب ہے ہر سو کھلا ہوا
حیرت یہ ہے کہ چشمِ تماشا کو کیا ہوا

اے ساعتِ گریز یہ کیا ہے معاملہ
کیوں دیکھتی نہیں ہو کہاں ہوں پڑا ہوا

بے چہرگی کی بھیڑ میں چہرہ تلاشتے
رنگوں سے خوشبوؤں سے مرا رابطہ ہوا

بارِ دگر کہو جو ابھی زیرِ لب کہا
میں سن نہیں سکا ہوں تمہارا کہا ہوا

پوچھیں گے ہم پہ کیوں نہیں اس کی عنائتیں
گر زندگی سے اپنا کبھی سامنا ہوا

ہم لب شکستہ لوگ تہی دست رہ گئے
گزرا قریب سے وہ سحر بانٹتا ہوا

مجھ پر یہ لطفِ خاص ہے میرے کریم کا
وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں اب تک لکھا ہوا

اس دور ابتلا میں ہوں اس سے مدد طلب
میں مطمئن ہوں اس کی طرف دیکھتا ہوا

کرتا ہوں زندگی سے مسلسل معانقہ
حرفِ ہنر ہے تارِ نفس سے ملا ہوا

اس کا خیالِ جاں فزا ہے بانسری کی لے
ہے ذکر اس کا چاندنی شب سے جڑا ہوا

دیتی ہے آ کے دستکیں خوشبو بصد نیاز
دامن کا چاک یوں ہی نہیں ہے سلا ہوا

محبت بولتی آنکھوں کا تہذیبی حوالہ ہے
محبت روح کے اوراق پر لکھی کہانی ہے

محبت دھیرے دھیرے سے اترتی ہے رگ و پے میں
محبت درد میں لپٹی ہوئی اک شادمانی ہے

محبت فاصلوں کو قید کر لیتی ہے مٹھی میں
محبت صورتِ تریاقِ رنج رائیگانی ہے

محبت عالمِ ہستی میں ہے تخصیص کی حامل
محبت کو فنا ممکن نہیں یہ جاودانی ہے

محبت ریشمی احساس سے رہتی ہے ہم رشتہ
محبت نرم گفتاری محبت خوش گمانی ہے

محبت خوشبوؤں ، رنگوں سے تصویریں بناتی ہے
محبت اپنی فطرت میں مزاجاً داستانی ہے

محبت خواب بُن کر رتجگوں کو پیش کرتی ہے
محبت کے روّیوں میں انوکھی میزبانی ہے

محبت کے لبوں پر ہر گھڑی اک سرمدی لے ہے
محبت کوئیلوں کی بلبلوں کی نغمہ خوانی ہے

محبت توڑتی ہے بت انا کے دل نوازی سے
محبت چارہ سازی ہے محبت گل فشانی ہے

محبت عالمِ بالا سے وابستہ حقیقت ہے
محبت خاک زادوں کی متاعِ آسمانی ہے

محبت عارض و لب پر مچلتی خوش نمائی ہے
محبت کی صباحت کا تخصص ارغوانی ہے

محبت اپنی مرضی کے مناظر خلق کرتی ہے
محبت کی تخیّل کے جہاں پر حکمرانی ہے

ہمارے ذوقِ رفاقت سے بے خبر ٹھہری
حیاتِ حلقۂ احباب مختصر ٹھہری

جنوں کی کار گزاری پہ حرف آیا ہے
کہ پور پور ریاضت بھی بے ثمر ٹھہری

میں مثلِ پھول رہا تازگی سے ہم رشتہ
مرے مزاج کی خوشبو نگر نگر ٹھہری

وہ جس نے لفظوں کی حرمت کو معتبر رکھا
اسی کی ذات زمانے میں معتبر ٹھہری

نئے مزاج نے سب کچھ بدل دیا یکسر
پرانی سوچ کی یلغار بے اثر ٹھہری

چمن کی سیر عجب تازگی کی حامل تھی
ہوائے صبح سے ہر بات خوب تر ٹھہری

کسی کے حسنِ طلب سے رہے ہیں وابستہ
یہ زندگی تو ہمیشہ ہی حیلہ گر ٹھہری

ہم تو خوشی کی راہ میں حائل نہیں ہیں دوست
پر کیا کریں کہ لطف پہ مائل نہیں ہیں دوست

یہ بے دلی یہ آدھی ادھوری محبتیں
ہم ایسے التفات کے قائل نہیں ہیں دوست

اب اور کس کے ساتھ کرو گے موازنہ
اب ہم کسی بھی دوڑ میں شامل نہیں ہیں دوست

رکھ دی ہیں ہم نے طاق پہ ساری رفاقتیں
اب پہلے جیسی فرصتیں حاصل نہیں ہیں دوست

ہم نے سنبھال رکھے ہیں آنکھوں میں تیرے خواب
ہم تجھ سے تیری یاد سے غافل نہیں ہیں دوست

آئے ہیں سب سے تیرا پتا پوچھتے ہوئے
گو تیرے لطفِ خاص کے قابل نہیں ہیں دوست

ہم اعتبارِ فکر و نظر لے کے آئے ہیں
کچھ اجلے موسموں کی خبر لے کے آئے ہیں

رکھی ہوئی ہے ہم نے نظر گرد و پیش پر
تجسیم ہوتے شام و سحر لے کے آئے ہیں

کھلنے لگا ہے آنکھ پہ جو منکشف نہ تھا
ہم اپنی جستجو کا ثمر لے کے آئے ہیں

دیکھے جسے یقیں نہیں وہ دیکھے ایک بار
آنکھوں میں خواب بارِ دگر لے کے آئے ہیں

رکھنا ہے اس کو ساتھ بڑے اہتمام سے
اک یادِ دلنواز کو گھر لے کے آئے ہیں

اترے گی بالکونی پہ پھر اجلی چاندنی
ہم اپنی ہر دعا کا اثر لے کے آئے ہیں

اک عمر ساحلوں پہ رہے خیمہ زن مگر
لوٹے تو ساتھ لعل و گہر لے کے آئے ہیں

کہہ دو اسے وہ پوری طرح جان لے ہمیں
ہم اپنے سارے عیب و ہنر لے کے آئے ہیں

وہ راستے سے لوٹ کے واپس نہ جائیں گے
جو ساتھ اپنا رختِ سفر لے کے آئیں ہیں

ہم اپنے عہد سے وابستہ بھی جدا بھی ہیں
ہیں خاک زاد مگر خاک سے خفا بھی ہیں

ہم ان سے لطف طلب ہیں اگرچہ جانتے ہیں
ہم اپنے واسطے خود باعثِ سزا بھی ہیں

وہ لوٹ آئیں تو تخفیف ہو بھی سکتی ہے
یہ اور بات کہ کچھ درد لا دوا بھی ہیں

یہ ایک طرفہ تماشہ ہے دیکھیے کیا ہو
انا پرست محبت میں مبتلا بھی ہیں

دل و دماغ کے اس کھیل کی بدولت ہم
ہیں اپنی ذات میں کچھ قید کچھ رہا بھی ہیں

یہ بے زبانی نہیں ہے تہی معانی سے
درونِ ساعت دوراں ہم اک نوا بھی ہیں

یہ چھاؤں بانٹتے ہیں اور دعائیں لیتے ہیں
ترے فقیر تونگر بھی ہیں گدا بھی ہیں

منظروں کی طرح سجاؤں تجھے
کیوں نہ اک نظم پھر سناؤں تجھے

اتنی حیرت سے دیکھتا کیا ہے
مجھ سے کچھ پوچھ میں بتاؤں تجھے

ٹوٹ سکتا ہوں جڑ بھی سکتا ہوں
آئینے! معجزہ دکھاؤں تجھے

تجھ کو تصویر کر چکا ہوں میں
روبرو اپنے لے کے آؤں تجھے

اے مری شاعری اجازت دے
چاند راتوں میں گنگناؤں تجھے

جو سپنا آنکھ میں رکھا ہوا ہے
اسی سے میرا فن مہکا ہوا ہے

توجہ ہو مگر پتھر نہ پگھلے
توجہ گر کبھی رسوا ہوا ہے

گریزاں قوس ہے مرکز سے مانا
مگر مرکز کہاں بدلا ہوا ہے

کسی منکر کے جادو کا اثر ہے
یقیں امکان سے روٹھا ہوا ہے

یہ میری خود فراموشی نہیں ہے
مسافت سے بدن ٹوٹا ہوا ہے

کھلی آنکھوں سے اب کیا اور دیکھوں
کہ ہر منظر مرا دیکھا ہوا ہے

سدا رہنا ہے ہم رشتہ جنوں سے
دلِ نادان نے سوچا ہوا ہے

جو خوشبو کی طرح مہکا گیا ہے
وہ منظر خواب میں دیکھا گیا ہے

دکھا سکتا ہوں کوئی معجزہ بھی
مجھے اس طور کب پرکھا گیا ہے

کہانی کا ہوں وہ کردار جس کو
قلم برداشتہ لکھا گیا ہے

ابھی تک ذہن سے نکلا نہیں ہے
جو حرفِ ناروا بولا گیا ہے

مرے پیشِ نظر بھی کچھ تو ہو گا
یہ کب پیشِ نظر رکھا گیا ہے

میں کیسے منکشف ہوتا کسی پر
مجھے جب سر سری سوچا گیا ہے

میں پس منظر میں رہتا ہوں کہ مجھ کو
کہانی سے جدا رکھا گیا ہے

سفر میں ساتھ چل سکتا تھا میں بھی
مگر مجھ سے کہاں پوچھا گیا ہے

مری سوچوں میں جس کی روشنی تھی
وہی سوچیں مری گہنا گیا ہے

جانے کیسا رشتہ ہے تقدیر کے ساتھ
بڑھ جاتی ہے مشکل ہر تدبیر کے ساتھ

آنکھوں کی تصویر بنائی جب ہم نے
خواب بھی ساتھ چلے آئے تصویر کے ساتھ

اس کے لفظوں میں اک عجب کہانی تھی
وہ پورے کا پورا تھا تحریر کے ساتھ

اس کی آنکھیں سپنے بنتی سوچتی ہیں
خواب نے زندہ رہنا ہے تعبیر کے ساتھ

مبہم باتیں کرنے والا تھک جائے گا
اک دن سب کچھ کہہ دے گا تفسیر کے ساتھ

اک دوجے سے دونوں مخلص تھے لیکن
بندھ نہ پائے پھر بھی اک زنجیر کے ساتھ

انوکھا درد ہے سب سے جدا ہے سرخوشی میری
ہوئی ہے ایک ایسی زندگی سے دوستی میری

مری گفتار سے کھلتا نہیں ہے مدعا میرا
مرے عیب و ہنر کی ترجماں ہے خامشی میری

تعجب کیا جو مجھ میں باغیانہ سوچ پلتی ہے
مری مٹی میں ہی گوندھی گئی تھی سرکشی میری

مثالِ بیج ہیں امکان کی پرتیں مرے اندر
کسی ان دیکھی دنیا کا سفر ہے زندگی میری

مرے لفظوں کی خوشبو سے مہکتی ہے مری ہستی
فروزاں ہے مرے لہجے سے ہر دم راستی میری

زمانہ جب بھی مجھ سے برسرِ پیکار ہوتا ہے
بچا لیتی ہے آگے بڑھ کے مجھ کو عاجزی میری

صباحت میری آنکھوں میں اترتی ہے تسلسل سے
مناظر سے رہی ہے عمر بھر وابستگی میری

رخِ گل پر تھرکتے اوس قطروں کی کہانی ہے
متاعِ لمحۂ موجود ہے یہ ان کہی میری

محبت نے عطا کی ہے کچھ ایسی عاجزی مجھ کو
ہراساں ہر گھڑی رہتی ہے مجھ سے خودسری میری

انتہائے گفتگو ہے خامشی
زندگی کی آبرو ہے خامشی

دھڑکنوں کا زیر و بم اپنی جگہ
شہرِ دل میں کو بکو ہے خامشی

معنی و الفاظ سے ہے ماورا
ایک پیہم جستجو ہے خامشی

ہے پسِ احساس ہر دم مضطرب
ان کہی اک آرزو ہے خامشی

چاندنی شب بالکونی اور یاد
بھیگی بھیگی خوبرو ہے خامشی

رات کے پچھلے پہر کی ہے دعا
آنسوؤں سے باوضو ہے خامشی

ہے کسی درویش کی پالی ہوئی
کچھ نہیں بس ایک ہُو ہے خامشی

کس قدر گہری ہے کتنی مطمئن
امتحاں میں سرخرو ہے خامشی

کونسی منزل پہ لائی ہے حیات
بستیوں میں چار سو ہے خامشی

ہونے والی ہے مکمل داستاں
خامشی کے روبرو ہے خامشی

اک عجب صورتِ حالات سے دو چار ہیں ہم
گو گرفتار نہیں پھر بھی گرفتار ہیں ہم

دیکھتے بھی ہیں مگر دیکھ نہیں پاتے ہیں
ہائے کس نیم نگاہی کے سزاوار ہیں ہم

ہر نئے درد سے بن جاتا ہے رشتہ اپنا
ہر گھڑی ایک اذیت کے طلبگار ہیں ہم

خاکساری ہمیں دیتی ہے خبر ہونے کی
اس لیے خاک نشینوں کے پرستار ہیں ہم

کوئی کر سکتا نہیں ہم کو جدا منظر سے
لوحِ احساس پہ لکھا ہوا کردار ہیں ہم

زندگی لطف پہ آمادہ نظر آتی ہے
اور یہ ایسی مسرت ہے کہ سرشار ہیں ہم

اک بہاؤ کی کہانی ہے میاں
زندگی دریا کا پانی ہے میاں

ہے تحرک سے وقارِ روز و شب
ورنہ تو سب رائگانی ہے میاں

شعر گوئی کب ہمارے بس میں تھی
یہ عطائے آسمانی ہے میاں

کس طرف جائیں کہ ہر اک موڑ پر
ایک مرگِ ناگہانی ہے میاں

یہ جو پلکوں پر لرزتے اشک ہیں
یہ رفاقت کی نشانی ہے میاں

گفتگو اپنا حوالہ تھی کبھی
اب فقط اک بے زبانی ہے میاں

معتبر ہوں بارگاہِ عشق میں
عشق میری راجدھانی ہے میاں

یہ مری ویران آنکھیں ، رتجگے
یہ کسی کی مہربانی ہے میاں

اب ہر اک منظر ہے زیر آب میری آنکھ میں
آ کے یوں ٹھہرے ہیں کچھ گرداب میری آنکھ میں

کب میسر ہو انہیں میرے نہاں خانے کی سیر
منتظر بیٹھے ہیں کچھ مہتاب میری آنکھ میں

رات کی رانی کی خوشبو دے رہی ہیں دستکیں
پل رہے ہیں رفتہ رفتہ خواب میری آنکھ میں

میں محبت بانٹتے احساس کا پروردہ ہوں
ہیچ ہیں یہ مندر و محراب میری آنکھ میں

مجھ کو باہر ڈھونڈنے کی اب کوئی حاجت نہیں
سب کے سب ہیں گوہرِ نایاب میری آنکھ میں

منتظر ہوں کب وہ ہوں گے خانۂ دل میں مکیں
ایک مدت سے ہیں کچھ احباب میری آنکھ میں

جب بھی کسی کے سر میں سماتی ہے بے حسی
اک طمطراقِ خاص دکھاتی ہے بے حسی

ماتم کریں یا چپ رہیں بے فائدہ ہے سب
خود ہم نے ناز و نعم سے پالی ہے بے حسی

کس کی مجال ہے اسے دکھلائے آئینہ
بے خوف سب کے سامنے رہتی ہے بے حسی

خوش فہمیوں نے اس کو گوارا کیا سو اب
سر چڑھ کے ہر سو بولتی پھرتی ہے بے حسی

دستار کی فضیلتیں بے مایہ ہو گئیں
یوں اہلِ زر نے سر پہ سجائی ہے بے حسی

ناصح تمہارے وعظ و نصیحت کی خیر ہو
اب سج سنور کے جشن مناتی ہے بے حسی

اب بے حسی کی زد پہ ہیں وابستگی کے رنگ
صحنِ وفا میں خاک اڑاتی ہے بے حسی

ملتی نہیں ہے جائے اماں زیرِ آسماں
یوں بستیوں میں آگ لگاتی ہے بے حسی

یہ بھی بہت ہے جستجوئے نا تمام میں
اک عکس تیرنے لگا کجلائی شام میں

اے عشق بارگاہِ عقیدت سے اٹھ کے دیکھ
کیا کیا جلا دیا ہے ترے احترام میں

لوحِ بدن سے مٹ گئیں ساری کہانیاں
اک ان کہی پڑی ہے دلِ تشنہ کام میں

دشوار لگ رہا تھا مگر معجزہ یہ ہے
طے ہو گیا ہے فاصلہ دو چار گام میں

اتراتی پھر رہی ہے چمن میں بہارِ گل
مستی بھرا پیام ہے پھولوں کے نام میں

جیسا بھی ہو سلوک گوارا ہے عشق میں
کچھ فرق اب نہیں رہا دانہ و دام میں

حرفِ نجات

رہبر و رہنما یا نبیؐ آپؐ ہیں
منبعِ نور ہیں راستی آپؐ ہیں

بے کسوں کے لیے آپؐ ہیں آسرا
دو جہانوں کی تابندگی آپؐ ہیں

روشنی جس قدر بھی زمانے میں ہے
آپؐ کی ہے عطا روشنی آپؐ ہیں

جو ہمارے تصور سے ہے ماورا
دونوں عالم کی وہ دلکشی آپؐ ہیں

آپؐ کا ذکر ہے راحتِ قلب و جاں
غم زدوں کے لیے ہر خوشی آپؐ ہیں

آپؐ کے فیض سے زندگی ، زندگی
مجھ خطا کار کی زندگی آپ ہیں

نبیؐ کی نعت لکھنا چاہتا ہوں ، با ہنر کر دے
مرے مولا زمانے میں مجھے بھی معتبر کر دے

زباں پر میری ہر لمحہ رہے صلِ علیٰ جاری
مجھے اپنے کرم کی نعمتوں سے بہرہ ور کر دے

تمنا ہے کہ جب پہنچوں مدینے تو بہر صورت
فضائے شہرِ آقا ہر دعا کو با اثر کر دے

مسلسل بوجھ بنتی جا رہی ہے زندگی میری
مری بنجر زمینوں میں نمو بارِ دگر بھر دے

مرے مولا مری رگ رگ میں یہ خواہش مچلتی ہے
کسی صورت مقدر میں مدینے کا سفر کر دے

لبِ احساس وا ہو نعت کہنے کا شعور آئے
مری یہ خشک آنکھیں آنسوؤں سے تر بہ تر کر دے